عبداللہ حسین کے منتخب ناولوں
(”اداس نسلیں“، ”نادار لوگ“، ”قید“) میں عورت کا مزاحمتی رویہ

(نسائی رد تشکیل کے تناظر میں)

مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار:

محمد عمران

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۱۹ء

عبداللہ حسین کے منتخب ناولوں
(”اداس نسلیں“، ”نادار لوگ“، ”قید“) میں عورت کا مزاحمتی رویہ
(نسائی رد تشکیل کے تناظر میں)

مقالہ نگار:

محمد عمران

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: عبد اللہ حسین کے منتخب ناولوں (''اداس نسلیں''، ''نادار لوگ''، ''قید '') میں عورت کا مزاحمتی رویہ (نسائی رد تشکیل کے تناظر میں)

پیش کار: محمد عمران رجسٹریشن نمبر: M/U/F16/1251

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اُردو

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

_____

تاریخ

اقرار نامہ

میں محمد عمران حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان صاحبہ کی زیر نگرانی مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

محمد عمران

مقالہ نگار

فہرست ابواب بندی

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
تفصیلی ابواب بندی	V
Abstract	IX
اظہار تشکر	XI

باب اول۔ نسائی رو تشکیل کا تعارف و اہمیت ۱

الف: تمہید ۱

i۔ موضوع کا تعارف ۱

ii۔ بیان مسئلہ ۲

iii۔ مقاصد تحقیق ۳

iv۔ تحقیقی سوالات ۳

v۔ نظری دائرہ کار ۳

vi۔ تحقیقی طریقہ کار ۴

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق ۴

viii۔ تحدید ۵

ix۔ پس منظری مطالعہ ۵

x۔ تحقیق کی اہمیت ۵

ب: تانیثیت ایک عمومی مطالعہ تعارف و اصول مباحث ۵

ج: تانیثیت اور نسائیت میں فرق ۶

i۔ مصری ۹

ii۔ یونانی ۱۰
iii۔ رومی ۱۲
iv۔ یہودیت ۱۲
v۔ عیسائیت ۱۳
vi۔ ہندو مذہب اور تہذیب میں عورت ۱۴
vii۔ اسلام میں عورت کا تصور ۱۵
viii۔ مغرب میں تانیثیت کی تحریک ۱۷
ix۔ اردو ادب میں تانیثیت ۲۱
x۔ تانیثیتی تنقید بطور ادبی تھیوری ۲۵
xi۔ نسائی رد تشکیل کا تعارف و اہمیت ۲۶
xii۔ مزاحمتی رویہ: ادبی تناظر اور اُردو ادب میں مزاحمتی رویہ ۲۹
حوالہ جات ۳۲

باب دوم۔ اداس نسلیں میں نسائی کرداروں کا مزاحمتی رویہ (نسائی رد تشکیل کے تناظر میں) ۳۵
الف: اداس نسلیں ایک مطالعہ ۳۵
i۔ اُداس نسلیں میں موضوعاتی تنوع ۳۶
ii۔ سیاسی نشیب و فراز ۳۷
iii۔ جنگیں ۳۸
iv۔ تہذیب و ثقافت ۳۹
v۔ مذہب ۳۹
vi۔ جاگیر دارانہ نظام ۴۰
vii۔ جنس ۴۰
viii۔ طبقاتی کشمکش ۴۲
ix۔ تقسیم ہجرت اور فسادات ۴۲

x۔ سماجی شعور کی فرمائی ۴۴
xi۔ کسانوں کے حالت زار ۴۴
xii۔ قید و بند کی زندگی ۴۵
xiii۔ اداس نسلیں کے رومانوی حوالے ۴۶
ب: ناول اداس نسلیں کی نسائی کرداروں کا مطالعہ تانیثیت تانسائی رد تشکیل کے تناظر میں ۴۶
i۔ ناول میں نسوانی کرداروں کی اہمیت ۴۶
ii۔ جنس اور تحفظ ۴۷
iii۔ عورت کی سماجی حیثیت ۴۷
iv۔ مرد کے حیوانی جذبات کی بھینٹ چڑھتے ہوئے نسوانی کردار ۴۷
v۔ عذرا ۴۸
vi۔ نجمی ۵۲
vii۔ عائشہ ۵۵
viii۔ شیلا ماتھر (بانو) ۵۶
ix۔ نعیم کی ماں اور سوتیلی ماں ۵۸
x۔ عذرا کی ماں اور خالہ ۵۸
xi۔ ے (فہمیدہ بیگم) ۵۸
xii۔ زہرہ بیگم ۵۹
xiii۔ پرویز کی بیوی ۵۹
حوالہ جات ۶۲

باب سوم۔ "نادار لوگ" میں نسائی کرداروں کا مزاحمتی رویہ (نسائی رد تشکیل کے تناظر میں) ۶۴
الف: عبداللہ حسین کے نسوانی کرداروں کے مزاحمتی افکار ۷۰
ب: نادار لوگ کے کرداروں کا نسائی رد تشکیل کے تناظر میں عمومی مطالعہ ۸۱
حوالہ جات ۸۵

باب چہارم۔ قید میں نسائی کرداروں کا مزاحمتی رویہ (نسائی رد تشکیل کے تناظر میں) **۸۷**

الف: مذہب کے نام پر استحصال کے خلاف عورت کا مزاحمتی رویہ ۸۶

i۔ قید کا مطالعہ سیاسی و سماجی تناظر میں ۹۴

ب: عبداللہ حسین کے نسوانی کرداروں کا روایت سے بغاوت ۱۰۳

i۔ رضیہ سلطانہ ۱۰۳

ii۔ مائی سروری ۱۰۸

ii۔ نسرین ۱۰۹

حوالہ جات ۱۱۲

باب پنجم۔ مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات **۱۱۳**

ا۔ نتائج ۱۱۷

ب۔ سفارشات ۱۱۸

ج۔ کتابیات ۱۱۹

Abstract

Title:
The resistive behavior of woman in Abdullah Hussain's "Udas Naslain", "Nadar Loug" and "Qad" in the context of Post-Feminism.

Abstract:

The nineteenth and twentieth centuries can truly be called the centuries of chaos and turmoil. There are no such examples of clash of civilizatios in human history. During this period many movements arose in the global scenario that have an impact influenced literature as othe spheres of life. Western movements also had an impact on Urdu literature, one of which is the feminist movement, which ushered in a new era in Urdu literature and the tendency to write feminist literature in a new style.

Abdullah Hussain holds a notable place among the Urdu writers of the twentieth century. Apart from novels, he has also short stories and noveletters. In his writings, the female characters are not as strong, dynamic and active as the male characters, but these characters have been carved according to the place given to women in society. In feudal society, man considers woman as inferior to himself. Whether she is a kiln worker or a university student, she remains an opperressed and subjugated woman who has been created for the comfort of man and who is forced to live according to his will.

Abdullah Hussain the traditional view of women. In his novels, woman is not independent, but she is well aware of her importance. The research examines the exploitative and resilient attitude of women in Abdullah Hussain's novels in the context of the post-feminist framework. Although his short stories are also available on the subject, but the proposed research is limited to selected novels. This research work is important because it applies

Western research theories to Abdullah Hussain's novels, which have expanded the scope of his novels and created new trends. Dozens of articles have been written on Abdullah Hussain's work before, but so far no post-feminist study of his novels has come to light. Therefore, in view of the importance of the subject matter, Abdullah's novels have been examined under a post-feminist framework. In these novels, the concept of woman has been introduced, which has led to the introduction of new research trends.

اظہار تشکر

میں سب سے پہلے اپنے رب تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے حوصلہ اور ہمت دی کہ میں یہ ایم فل اُردو کا مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔ اس کے لیے اللہ رب العزت کا جس کا قدر شکر کیا جائے اس قدر کم اسی ذات نے دوران تحقیق پیش آنے والی مشکلات کو دور کیا۔ میں اپنی نگران ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کا بے حد شکر گزار ہوں جن کی رہنمائی اور مہربانی سے یہ تمام مراحل آسان ہوتے گیے اور مقالہ بروقت تکمیل کی منزل تک پہنچا۔

میں اپنے پر خلوص دوستوں، آمنہ حفیظ، رفیع الدین، ظفر اقبال کا شکر گزار ہوں جنھوں نے بھرپور تعاون کیا۔ اس کے ساتھ اگر میں وسیم عباس خٹک کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ بے انصافی ہو گی ان کو جہاں پہ بھی میرے موضوع کے حوالے سے کتاب ملی وہ کتاب انہوں نے بغیر معاوضہ لیے مجھے فراہم کی۔ مختصر یہ کہ انہوں نے اپنی قوت سے بڑھ کر تعاون کیا۔

اپنی والدہ اور والد محترم کی دعاؤں اور مالی معاونت کا بھی شکر گزار ہوں۔ آخر میں اپنے کمپوزر رضوان علی کا ممنوں ہوں جنھوں نے بروقت مقالہ کمپوز کر کے دیا۔

محمد عمران
اسکالر ایم فل اردو

باب اول:

نسائی رد تشکیل کا تعارف و اہمیت

الف: تمہید

i. موضوع کا تعارف

انیسویں و بیسویں صدی ہنگامہ خیز تھیں۔ انسانی تاریخ میں تہذیبوں کے ٹکراؤ کی ایسی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ عالمی دنیا میں بہت سی تحریکوں نے جنم لیا۔ جس نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا۔ مغرب سے اٹھنے والی ان تحریکوں نے اردو ادب پر بھی اثرات مرتب کیے۔ ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، جدیدیت، مابعد جدیدیت، نو آبادیات، مابعد نو آبادیات، وغیرہ جیسی کئی تحریکیں سامنے آئیں۔ انہی میں سے ایک تانیثیت کی بھی ہے جس سے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور تانیثی ادب کو ایک نئے طرز سے لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔

مغرب میں جن خواتین مصنفین نے اس کو ترقی دی اور اپنی تحریروں میں اسے شامل کیا، عورت کی آزادی اور اس کے حقوق کی بات کی، سماج میں اس کا ایک مقام متعین کرنے کے لیے آواز بلند کی۔ ان میں لوئس آسٹن (Louise Aston, 1814-1941)، ورجینا وولف (Virginia Wolf, 1882-1941)، الزبتھ بلیک ویل (Elizabeth Blaikwell, 1821-1910)، سائمن دی بوائر (Simone de Beauvoir, 1908-1986)، مایا اینجلو (Maya Angelou, 1928-2014)، کولٹ گوئیلم (Colette Guillanmin, 1934) وغیرہ شامل ہیں۔

اردو ادب میں بھی اس رجحان نے زور پکڑا اور نثر و شاعری دونوں کو متاثر کیا۔ اردو ادب میں اہل علم نے اس پر قلم اٹھایا۔ ان میں سر سید احمد خان (۱۸۱۷۔۱۸۹۸)، مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶۔۱۹۱۲)، عبد الحلیم شرر (۱۸۶۰۔۱۹۲۶) اور علامہ راشد الخیری (۱۸۶۸۔۱۹۳۹) وغیرہ شامل ہیں۔ ان مصنفین نے عورت کے مسائل اور الجھنوں کو عورت کے مقام پر جا کر محسوس کیا اور اسے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ اسی طرح خواتین مصنفین نے بھی اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے اصلاحِ نسواں کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔

۱۹۶۰ کی دہائی کے بعد ادبی نظریات کے بڑھتے ہوئے رجحان نے ادب کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا ایک رخ متعین کیا۔ جس میں نثر اور شاعری دونوں شامل ہیں۔ اس رجحان کی رو سے خواتین مصنفین نے اپنی تخلیقات میں تانیثیت کے حوالے سے کئی پہلوؤں کو شامل کیا اور عورت کے حق میں آواز بلند کی۔ جن میں قراۃ العین حیدر، جیلانی بانو، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، عذرا عباس اور زاہدہ حنا وغیرہ جیسے نام نمایاں ہیں۔ بیسیوی صدی کے نصف اول میں جن افسانہ نگاروں کے ہاں عورت کی استحصالی صورتیں نظر آتی ہیں ان میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور عبداللہ حسین وغیرہ شامل ہیں۔ تقسیم کے بعد انتظار حسین، قراۃ العین حیدر، حجاب امتیاز علی، عبداللہ حسین، منشاء یاد وغیرہ کے افسانوں اور ناولوں میں تانیثی رویے غالب نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ان ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں عبداللہ حسین کا نمایاں مقام ہے۔ ناولوں کے علاوہ انہوں نے افسانے اور ناولٹ بھی لکھے ہیں۔ عبداللہ حسین کی تحریروں میں نسائی کردار اگرچہ مرد کرداروں کی مانند مضبوط، متحرک اور فعال تو نہیں تاہم یہ کردار ہمارے معاشرے میں عورت کو دیئے گئے مقام کے عین مطابق تراشے گئے ہیں۔ جہاں جاگیر دارانہ سماج میں عورت کو مرد ہمیشہ اپنے سے کم تر شے سمجھ کر استعمال کرتا ہے پھر چاہے وہ بھٹے پہ کام کرنے والی مزارعی ہو یا یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکی۔ وہ ایک ایسی محکوم اور مجبور عورت ہی رہتی ہے۔ جسے ازل سے مرد کی راحت کے لئے تخلیق کیا گیا ہے اور جو اس کی مرضی کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ مردانہ سماج کا پہنایا گیا زبردستی اور محکومی کا یہ ہار ہمیشہ اس کی اپنی شناخت کو مسخ کرتا ہے۔ عبداللہ حسین کی تحریریں ہی ان کی شخصیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اپنے ناولوں میں انہوں نے معاشرتی روایات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ عورتوں کے حوالے سے عبداللہ حسین نے روایتی تصورات سے ہٹ کر بات کی ہے۔ روایتی تصور عورت یہ ہے کہ عورت گھر کی چار دیواری میں رہے اور مذہب کے عائد کردہ حقوق و فرائض سرانجام دیئے۔

ان کے ناولوں میں عورت اپنے قدموں پہ کھڑا ہونا جانتی ہے اور مرد کے مقابلے میں زیادہ فعال ہے۔ اس لحاظ سے یہ تحقیق مابعد تانیثیت کے ایک نئے رخ کا احاطہ کر چکی ہے۔ جس میں عورت ایک نئے انداز سے اپنی قدریں نبھاتی دکھائی دیتی ہے۔

ii. بیان مسئلہ

تیسری صدی عیسوی میں آزادیِ نسواں کی پہلی آواز اٹھی جو مختلف منازل طے کرتی ہوئی سولہویں صدی میں مغربی ادب کا حصہ بنی۔ جس میں عورت نے اپنے حق میں آواز بلند کی اور اٹھارھویں صدی میں خواتین نے

عورتوں کے لیے کھل کر کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد آزادی نسواں کی یہ تحریک زور پکڑتی چلی گئی اور انیسویں صدی میں منظم انداز میں اس پر کام ہونے لگا۔ عورتوں کو شعور دلایا گیا کہ وہ کس طرح اپنا حق حاصل کر سکتی ہیں اور اس کے لیے ''ادب'' کا سہارا لیا گیا۔ ہر شعبہ زندگی کی طرح مغربی ادب کے اثرات بھی اردو ادب نے قبول کیے۔ اردو ناول میں تانیثیت پر جتنا کام ہوا ہے اس میں تانیثیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن کچھ کردار ایسے بھی تخلیق کیے گئے جو تانیثی رویوں سے مزاحم نظر آتے ہیں۔ عبداللہ حسین کے منتخب ناولوں میں ان خواتین کردار کا جائزہ نسائی رد تشکیل (Post Feminism) کے تحت کیا گیا ہے۔

iii. مقاصد تحقیق

زیرِ نظر تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیشِ نظر رہے:

۱۔ عبداللہ حسین کے ناولوں میں تصور عورت کو مابعد تانیثی نظریات کے حوالے سے اجاگر کیا۔

۲۔ عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کا استحصال اور مزاحمتی رویہ بیان کرنے کو شش کی۔

۳۔ عبداللہ حسین کے نسوانی کرداروں کا مزاحمتی رویہ سماجی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

iv. تحقیقی سوالات

۱۔ عبداللہ حسین کے ناولوں میں مثالی عورت اور تصور عورت کو کیسے پیش کیا گیا ہے؟

۲۔ عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں میں عورت کا استحصال اور مزاحمتی رویے کو کس طرح پیش کیا ہے؟

۳۔ عبداللہ حسین نے نسوانی کرداروں کا مزاحمتی رویہ سماجی تناظر میں کس طرح بیان کیا ہے؟

v. نظری دائرہ کار

زیر نظر تحقیق میں تجزیاتی مطالعہ سے کام لیا ہے۔ اصل ماخذ و عنوان سے استفادہ کیا ہے۔ اس ذیل میں عبداللہ حسین کے ناولوں میں سماجی رسوم و رواج کے خلاف مزاحمتی رویے کا مابعد تانیثیت کے تناظر میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تجزیے کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ عورت کے فرائض پر قبضہ۔

۲۔ عورت کے وقت پر قبضہ۔

۳۔ جسمانی تخلیقات۔

۴۔ جنسی شرائط۔

۵۔ عورت مرد سے تعلق کی بنیاد ہی کسی فیصلے کی اہلیت۔

۶۔ شادی سے عورت کی ذہانت اور آزادی کا استحصال۔

۷۔ عورت ہی عورت کا استحصال کرتی ہے۔

زیر نظر تحقیق میں درجہ بالا نکات کا اطلاق کرتے ہوئے عبداللہ حسین کے ناولوں میں مزاحمتی رویے کا مابعد تانیثی مطالعہ کیا گیا ہے کہ عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت ان پر پورا اترتی ہے یا پھر ان کی عورت روایت سے بغاوت کرتی نظر آتی ہے۔

vi. تحقیقی طریقہ کار

زیر نظر مقالے میں دستاویزی طریقہ تحقیق اختیار کرتے ہوئے بنیادی کتب کے ساتھ ساتھ تاریخی اور تنقیدی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ آصف فرخی کا مضمون "میلہ گھومنی کی بازدید" اور ڈاکٹر فہمیدہ ریاض کی مرتبہ کتاب "ادب کی نسائی ردِ تشکیل" کو بطور فریم ورک لاگو کرتے ہوئے سماج کے رویوں سے منحرف نسوانی کرداروں (Post Feminism) کے تصورات سے جائزہ لیا گیا ہے۔

عبداللہ حسین کے لکھے گئے مضامین اور مقالہ جات اس سلسلے میں قابل توجہ تھے۔ تاہم بہ وقت ضرورت اس سلسلے میں مختلف افراد سے ملاقات اور انٹرویو بھی کیے گئے ہیں۔

vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

تانیثیت کی تحریک نے اردو ادب کے ہر گوشے کو متاثر کیا، چاہے وہ نثر ہو یا شاعری۔ اس حوالے سے خواتین مصنفین نے بھی (نثر اور شاعری) میں صغرا ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، قرۃ العین حیدر، نثار عزیز بٹ، جیلانی بانو، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، عذرا عباس اور زاہدہ حنا کے ہاں ملتے ہیں۔ اردو ناول میں تانیثیت کو مختلف حوالوں سے دیکھا یا گیا، جس میں ناولوں کا تانیثی مطالعہ، ناولوں کے کرداروں کا تانیثی مطالعہ، ناولوں میں عورت بحثیت موضوع اور ناولوں میں تصور عورت وغیرہ جیسے موضوعات شامل ہیں۔ مختلف جامعات میں اس حوالے سے بہت سے مقالے لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے محققین نے رسائل میں بھی ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ جس میں مختلف تحریروں کو تانیثیت کے حوالے سے پرکھا گیا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے بعد اس حوالے سے بہت کام کیا گیا ہے جس سے اس کی اہمیت میں روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔

عبداللہ حسین کا شمار اردو کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی حیات ہی میں ان کی تخلیقات پر ایم۔فل کی سطح پر کئی تحقیقی کام ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ لیکن عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کے کردار کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے عبداللہ حسین کے ناولوں کا ہو چکا ہے۔ مابعد تانیثی مطالعہ اہم اضافہ ثابت ہو گا۔

viii. تحدید

زیر نظر مقالے میں عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کا مزاحمتی رویہ اور عورت کا استحصال مابعد تانیثی فریم ورک کے تناظر میں کیا گیا ہے کہ عبداللہ حسین کے افسانے بھی موجود ہیں لیکن مجوزہ تحقیق منتخب ناولوں تک محدود رکھی گئی ہے۔

ix. پس منظری مطالعہ

عبداللہ حسین کے ناولوں کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور ان کے ناولوں میں عورت کا مزاحمتی رویے پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی تانیثیت کے موضوع پر لکھی گئی کتب کو بنیادی ماخذ سمجھا گیا ہے۔

x. تحقیق کی اہمیت

یہ تحقیقی کام اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں مغربی (انگریزی ادبی) تحقیقی نظریات کا عبداللہ حسین کے ناولوں پر اطلاق کیا گیا ہے۔ جس سے ان کے ناولوں میں وسعت اور نئے رجحانات پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ یہ تحقیقی کام آئندہ آنے والے اردو ادب کے محققین کے لئے نئی تحقیقی راہیں متعارف کرانے اور نئے رجحانات سے تعارف کا باعث ہے۔ اس سے قبل عبداللہ حسین کی شخصیت کی مختلف جہتوں پر کئی سندی مقالات لکھے جا چکے ہیں لیکن ان کے ناولوں کا مابعد تانیثی مطالعہ تاحال سامنے نہیں آیا ہے۔ چنانچہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر عبداللہ حسین کے ناولوں کو مابعد تانیثی فریم ورک کے تحت پرکھا جائے گیا ہے۔ ان کے ناولوں میں تصور عورت کی پیشکش معلوم کی گئی ہے جو نئے تحقیقی رجحانات سے تعارف کا باعث ہے۔

ب۔ تانیثیت ایک عمومی مطالعہ تعارف و اصول مباحث

تانیثیت اسم کیفت ہے تانیث کا تانیثیت عربی زبان کا لفظ ہے۔

فرہنگ آصفیہ میں تانیثیت کے لغوی معنی کچھ یوں ہیں:

''تانیثیت: اسم مونث تذکیر کا نقیض۔ مونث ہونا۔ ضد نر۔ مادہ مادین''(۱)

فیروز اللغات، جامع اللغات اور نور اللغات میں تانثیت کے ایک جیسے معانی بیان ہوئے ہیں اور ان کا مفہوم بھی فرہنگ آصفیہ کی طرح ایک ہی بیان ہوئے ہیں۔

ج۔ تانیثیت اور نسائیت میں فرق

۱۔ تانیثیت ایک وسیع المعانی تھیوری ہے جس میں خواتین کے مختلف مسائل اور رویوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ معاشرے میں خواتین کے معاشی استحصال، جنسی جبر، سماجی ناہمواریوں، فرسودہ خاندانی رشتوں میں تشخص کی، قانونی عدم تحفظ تلاش تانیثیت ہے۔

۲۔ جب کہ نسائیت عورت ذات کا ہمہ جہتی فلسفیانہ ادراک اور شعور ذات شامل ہے جس میں عورت کے جسمانی وجود سے لے کر فطری، نفسیاتی اور ثقافتی پہلو شامل ہیں۔

۳۔ معاشرے میں عورت کی مظلومیت اور استحصال کا شعور اجاگر کرنا نسائیت ہے۔

۴۔ جب کہ یہ احساس کے معاشرے میں عورت ظلم و جبر کا شکار ہے۔ اس صورت حال کو شعوری طور پر بدلنے کی کوشش کرنا تانیثیت ہے۔

۵۔ تانیثیت ایک نظریاتی اور حیاتیاتی اصطلاح ہے جب کہ نسائیت ثقافتی وضع کردہ اصطلاحات ہیں۔

۶۔ تانیثیت میں مرد اور عورت کی برابری کی بات کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد مرد اور عورت کے درمیان رشتوں میں برابری ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں مردوں کے مساوی حقوق کی بات کرنا تانیثیت ہے۔ جب کہ نسائی تحریک میں صرف طبقہ نسواں کے حقوق اور حثیت کو دیکھا جاتا ہے۔ عورتوں کے جذبات کو مردوں کی طرح بیان کرنا نسائیت ہے۔

۷۔ نسائیت اور تانیثیت، عورت کی حسیت کے دو نمایاں پہلو ہیں جنہیں نسائی حثیت کے تحت رکھا گیا ہے۔ اول الذکر کا تعلق جذباتی حسیت سے ہے، جب کہ آخر الذکر کا فکری حثیت سے ہے۔ نسوانیت اور نوبلوغیت سے تعلق رکھنے والے شدید جذبات کے اظہار کو ''نسائیت'' کا نام دیا جاتا ہے۔

۸۔ نسائیت عورتوں کے ان خیالات و احساسات کا احاطہ کرتی ہے جو ان کے تجربات، مشاہدات، گھریلو ماحول اور ماحولیاتی جبر کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ تانیثیت نہ صرف صنف کی بنیاد پر جبر کو رد کرتی ہے بلکہ معاشرے کی اس ذہن سازی کو بھی رد کرتی ہے جو عورت کو کم تر گردانتی ہے۔

اصطلاحی لحاظ تانیثیت سے مراد عورت کے حقوق و اوصاف ہیں اور اس کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نفسیاتی شعور ہے یعنی اس کا اپنی ذات کا احساس اور شعور ہے۔ اب یہ شعور با قاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے اور مختلف ادوار میں اس تحریک کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً حقوق نسواں کی تحریک، بیداری نسواں کی تحریک، آزادی نسواں کی تحریک، تحریک نسواں وغیرہ وغیرہ۔

موجودہ دور میں اس تحریک کے لیے تانیثیت کی تحریک تانیثیتی تحریک استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے اور عورتوں سے متعلق تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اور ان تمام امور کا احاطہ کرتا ہے جو عورتوں سے متعلق ہیں۔ انگریزی میں تانیثیت کے لیے (Feminism) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اب تانیثیت کی طرح (Feminism) کی لغوی وضاحت ضروری ہے۔ اکسفورڈ ڈکشنری میں اس کے لغوی معنی اس طرح ہیں۔

> "The advocacy of women's on the ground of equality of the sexes" (2)

اصطلاحی اعتبار سے دیکھا جائے تو تانیثیت حقوق نسواں کی تحریک ہے عورتوں کی سیاسی، قانونی حقوق کے حصول کے لیے تحریکیں چلانا اور عورتوں کے حق خود ارادیت کے لیے کوشش اور جدوجہد میں حقوق نسواں کی تعریف کے زمرے میں شامل ہے۔ آج دنیا بھر کی نسائی تحریک میں شامل لوگ تانیثیت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ اس بات کو تسلیم کرنا کہ سماج میں عورت کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اور اسی رویے کو تبدیل کرنے کے لیے کوشش کرنا ہی تانیثیت ہے۔ خواتین پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اُٹھانا یا ان کے حقوق کی بات کرنا تانیثیت ہے"۔ (۳)

> "فیمینزم یا تانیثیت نام ہے اس احساس کا کہ معاشرے میں پدری نظام مسلط ہے۔ وہ تمام لوگ چاہے مرد ہو یا عورتیں جو اس کو بدلنا چاہتے ہیں وہ فیمنسٹ ہیں"۔ (۴)

تانیثیت کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھیں کہ عورت کیا ہے؟ عورت دنیا کا سب سے پرانا اختلافی موضوع ہے۔ ہر عہد میں عورت کے بارے میں تصورات و نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ہر دور میں عورت پر لکھا جاتا رہا ہے۔ ہر عہد میں عورت کے بارے میں لکھا جاتا رہا ہے۔ تاریخ میں آج تک عورت پر جو کچھ بھی لکھا گیا اس میں عورت کو تصوراتی نقطہ نظر سے لیا گیا گویا کہ عورت ایک نہ سمجھ میں آنے والی حقیقت ہے اس حقیقت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ہر زمانے میں مفکرین، معلمین، مبلغین اور ناقدین نے اپنے انداز میں اس کی وضاحت کی اور ہر کسی نے عورت کو اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت روایات اور اقدار کی ضروریات کو مد نظر

رکھتے ہوئے پیش کیا۔ کہ عورت کے وجود اور اس کو بطور انسان کبھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت سیمون دی بوائر نے نہایت مختصر انداز میں کی جیسے تاریخ کبھی بھی نہیں جھٹلا سکتی۔

''کہ عورت پیدا نہیں ہوتی بنادی جاتی ہے''۔(۵)

مراد یہ ہے کہ معاشرے میں عورت اور مرد کی تقسیم فطری سے زیادہ ثقافتی ہے تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر کسی نے عورت کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اس کی پوری ذات کی وضاحت کوئی بھی نہیں کر پایا۔ مرد نے عورت کو کبھی دیوی بنا کر اس کی پوجا کی اور کبھی مال تجارت بنا کر اس کی خرید و فروخت کی۔ بابل روم یونان کے ایوانوں میں، فارس، بغداد اور قرطبہ کے محلوں، فاتحین کے قلعوں اور درباروں سے لے کر لکھنو و دلی اور لاہور کے بازاروں تک اس بولی لگائی گئی اور عورت مختلف قیمتوں پر بکتی رہی اور بدلتی رہی۔ تاجر بدلتے رہے لیکن عورت کی سوداگری وہی رہی کبھی عورت کو میدان جنگ میں مال غنیمت کے طور پر جیتا گیا تو کبھی عورت کو زندہ دیوار میں چنوایا گیا اور کبھی زندہ عورت کو مردہ مرد کے ساتھ جلا دیا گیا تو کبھی عورت کے لیے تاج محل، شیش محل، بارہ دریاں اور قلعے بنائے گئے اور عورت کی ایک ادا پر ملک قربان کیے گیے۔ دوسری طرف وہ عورت بھی ہے جو سال ہا سال سے کھیتوں میں فصل اُگانے میں مصروف ہے اور وہ جانور پال رہی ہے۔ سڑکوں پر پتھر کوٹ رہی ہے جھاڑو دے رہی اور مختلف شعبوں مین اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔ مختصر یہ کہ مجموعی طور پر تمام حیثیت اور اہمیت کے باوجود عورت کا استحصال کیا جاتا رہا اور ظلم و جبر کا وہ شکار رہی ہے۔ اسے حقارت کا نشانہ بنایا جاتا رہا بجائے اس کے اسے جیتا جاگتا انسان اور معاشرے کا فرد سمجھا جاتا۔ عورت کو محبوبہ دیوی، ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے ساتھ ساتھ کنیز، لونڈی، رکھیل اور طوائف جیسے القابات سے نوازا گیا۔

عورت ہی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر حاوی تھی اور اس دور کا سادہ لوح انسان یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ صرف مادہ کے بطن سے ہی ہر ذی روح کی پیدائش کا یکساں سلسلہ جاری ہے عورت کی سماجی برتری نے ایک ایسی دیوی کا درجہ پایا جس کے دم قدم سے بہار تھی وہ پھل اکھٹے کرتی اناج اُگاتی، برتن بناتی، کپڑے سیتی اور آپس کے جھگڑے چکاتی تھی۔ شوہر کے انتخاب یا اس سے ترک تعلق کے سلسلے میں وہ بالکل آزاد تھی اور خاندان کی سربراہ ہونے کی حیثیت سے نسب کا سلسلہ بھی عورت سے چلتا تھا بلکہ اولاد اور مال دونوں اس کی ملکیت ہوتے تھے۔

یہ اس کی محنت و مشقت کا پھل تھا اس زمانے میں مرد نے عورت کے ساتھ زراعت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جوں جوں زراعت میں منافع زیادہ شروع ہونے لگا تو مرد نے درجہ بدرجہ اسے اپنے قبضے میں لینا شروع کر دیا۔ اس طرح معاشی معاملات جو ایک طویل عرصے سے عورت کے ہاتھ میں تھے مرد کے دائرہ اختیار میں چلے

گئے۔ فرینڈرک اینگلن کا کہنا ہے کہ سماجی پیداوار کے دائرہ سے الگ کر دیے جانے کے بعد بیوی گھر کی پہلی خادمہ بنی۔[۶] اس طرح مادری معاشرہ پدر سری معاشرے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ معاشرے میں عورت کی حیثیت رفتہ رفتہ گرنا شروع ہو گئی اور مادر کل (دیوی) کا رتبہ کم ہوتا چلا گیا۔

سومیری[۷] تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے جس میں عورت کے بارے میں متضاد خیالات ملتے ہیں ان کے ہاں بیوی کا تصور تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے لیکن اس کے ساتھ سومیریوں کے ہاں طوائف کا وجود بھی ملتا ہے اور طوائف ہونا ان کے نزدیک کوئی بری یا قابل اعتراض بات نہ تھی۔ عصمت فروشی ان کے نزدیک تقدس کا درجہ رکھتی تھی۔ سومیری مندروں میں نہ صرف دیواسیاں (پجارنیں) بل کہ طوائفیں بھی بڑی تعداد میں رہتی تھیں۔ یہ مقدس طوائفیں تھیں جو دراصل مندر سے وابستہ دیوداسیوں کا ہی ایک طبقہ تھیں۔[۸] سومیریوں کے ہاں عورت کے بارے میں نہایت اعلیٰ پاکیزہ شفقت سے بھرپور خاتون خانہ کا دل آویز لطیف تصور بھی موجود تھا لیکن گھریلو عورت کی تقدس کی پامالی کی سزائیں سخت نہ تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بد چلنی زیادہ بری سمجھی جانے لگی اور اس کے بدلے میں وہ مرد کے مقابلے میں زیادہ زیر عتاب آئی۔ اس کو قتل کر دیا جاتا اور مرد کو چھوڑ دیا جاتا۔[۹] اس کا مطلب ہے کہ ان کے ہاں عورت کی عزت یا اس کی اپنی کوئی اہمیت اتنی زیادہ نہ تھی بل کہ حرف عورت کے شوہر یا وارث کی عزت پر آتا تھا۔

i. مصری

سومیریوں کے بعد مصری تہذیب ہے اور اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے تاریخ کے اس طویل عرصے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عورت کی حیثیت اور کردار ہمیشہ ایک جیسا ہی رہا ہو۔ مصریوں کی زندگی میں دیوی کا بڑا عمل دخل تھا وہ اسے خوشحالی اور زرخیزی کا بھی باعث سمجھتے تھے تو دوسری طرف تباہی و بربادی کی علامت بھی۔ اسی تصور کا عکس ان کی معاشرتی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ شاہی خاندان میں تخت کی وارث عورت بتائی جاتی ہے اگرچہ وہ وارث تو ہوتی تھی مگر تخت پر مرد ہی قابض ہوتا تھا اور خود کو حقیقی حکمران ثابت کرنے کے لیے ضروری سمجھتا تھا کہ وہ وارث عورت سے شادی کرے چاہے وہ اس کی بہن ہی کیوں نہ ہو اس طرح ہر بادشاہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے ہی خاندان کی وارث عورت سے شادی کرتا۔ اس روایت کی وجہ سے باپ کو بیٹی یا بہن سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح فراعنہ کی بیویاں اپنے شوہروں کی طرح مقتدر و مختار سمجھی جاتی تھیں اور حکومت کے معاملات میں ان کا پورا عمل دخل ہوتا تھا۔

حکومت اور دولت حاصل کرنے کی خاطر فراعنہ اپنی بہنوں سے شادی کر لیتے تھے ملکہ نیت ہی ٹپ اور ملکہ مرت نیت لاکھوں ایکڑ اراضی جہیز میں لائی تھیں۔ ملکہ ہت شپ ست Hatshepsutتو تھمس اول Thumsut-1 کی بیٹی تھی اور فرعون کی حیثیت سے حکمرانی کے فرائض ادا کرتی تھی۔ اپنے سوتھیلے بھائی تو تھمس دوم سے اس نے شادی کی اور مصر پر حکومت کرنے لگی۔[۱۰] بادشاہ شاہی خاندان کے علاوہ بھی شادیاں کرتا تھااس طرح بادشاہ کی بیویوں کی دو اقسام تھیں یعنی شاہی خاندان والیاں اور غیر شاہی خاندان والیاں۔ ان میں سے ایک بیگم کو وہ خاص بیوی کا درجہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ سیاسی تعلقات کے لیے باہر یعنی غیر ملکی شادیاں بھی کرتا تھا۔ ان کی بھی دو اقسام تھیں پہلی قسم جو کسی دوسرے ملک شاہی خاندان میں شادیاں ہوتی تھیں اور دوسری قسم وہ ہوتی تھی جو شادیاں اپنے سے کم تر یا ماتحت یا مفتوح ممالک یا علاقوں میں کی جاتی تھیں۔ بعض اوقات بادشاہ اپنے ماتحتوں کو حکم بھی دیا کرتا تھا کہ اسے اپنی بیٹی غلام لونڈیاں بھجوادے اور اس کے علاوہ مال وزر بھی۔ مصری اپنی بیٹیاں دوسرے ملکوں کے حکمرانوں کو نہیں دیا کرتے تھے بلکہ طاقتور بطور خراج بیٹی پیش کرنے کا رواج تھا۔

بادشاہ کے حرم میں کئی بیویاں اور عورتیں ہوتی تھیں۔ ان میں اکثریت وہاں کے آداب و اطوار رہن سہن سے ناواقفیت کے باعث اپنے آپ کو اجنبی سمجھتی ہوں گی اور دوسرے بھی ان سے متعصبانہ سلوک رکھتے ہوں گے لیکن اس ساری قربانی کی وجہ صرف اور صرف یہ ہوتی تھی کہ ان کی اس قربانی کی وجہ سے ان کا ملک کا محفوظ رہے اور اُن کے باپ اور بھائیوں کا تخت قائم رہے اس کے علاوہ وہ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی تھی اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہی خاندان کے علاوہ عام مصری معاشرے میں شادی کے سلسلہ میں کسی قسم کی کوئی مذہبی سیکولر رسومات نہیں ہوتی تھیں جب شادی طے ہو جاتی تو لڑکی کے والد کو رقم دی جاتی تھی۔ طلاق کی صورت میں عورت اپنا جہیز یا رقم جو وہ ساتھ لاتی تھی واپس لے جاتی۔ مطلقہ عورت دوسری شادی کر سکتی تھی۔

قانون کی نظر میں عورت اور مرد مساوی تھے بطور شاہد عورت مرد برابر تھے دونوں کے لیے ایک جیسی سزائیں تھیں وراثت کی تقسیم کے سلسلے میں عورت شوہر، بیٹی باپ کی وراثت ہو سکتی تھی اگر لڑکوں اور لڑکیوں سمیت کئی وارث ہوں تو جائیداد کی آمدنی برابر تقسیم ہونی تھی۔

ii. یونانی

قدیم قوموں میں جس کی تہذیب سب سے شاندار نظر آتی ہے وہ اہل یونان ہیں ان کی شاندار روایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ یونانی فلسفیوں قانون سازوں، ادیبوں اور سیاست دانوں نے اپنی عورت

کے ساتھ انصاف کیا ہو گا۔ وہاں جب ہم عورت پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ شوہر کی ملکیت تسلیم کی جاتی تھیں اور مرد کو سے بیچنے کا حق حاصل تھا۔ وہ اپنی بیوی کو کسی بھی تحفے کے طور پر دے سکتا تھا کبھی بھی کسی عورت کو کچھ عرصے کے لیے مانگے پر دے سکتا تھا۔ اس رواج کے خلاف عورت آواز بھی نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ یعنی وہ صرف جنس تھی اس کو اس قسم کے کوئی اختیار نہیں تھے کہ کسی سے کوئی معاہدہ یا قرض لے۔ مشہور یونانی قانون دان سولن کے قانون کے تحت اگر کوئی عمل عورت کے زیر اثر کیا جائے تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی۔[۱۱] یونانی قوم کے ابتدائی دور میں اخلاقی نظریہ قانون، حقوق اور معاشرتی برتاؤ غرض یہ کہ ہر اعتبار سے عورت کی حیثیت بہت گری ہوئی تھی۔ یونانی خرافیات (mytheology)میں ایک خیالی عورت پاونڈرا(Pandora) کو تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا۔ پاونڈرا ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی خرابیاں دینے والا ہیں یونانی کہانی کے مطابق ایک دیوتا پرومی تھیس (Parometheus)نے آسمان سے آگ چرائی اور اس کو زمین میں بسنے والے انسانوں تک پہنچا دیا۔ دیوتاں کے بادشاہ زیوس(Zeus) کو یہ بات ناگوار گزری چنانچہ اس نے زمینی مخلوق سے اس نعمت کو کالعدم کرنے کے لیے ایک عورت تخلیق کی جس کا نام پانڈورا رکھا اس کے بعد اس نے اس پہلی عورت کو زمین پر بھیج دیا۔ زمین پر موجود اس وقت ایک دیوتا ایمپی تھیس آباد تھا۔ اس نے پاونڈرا کے حسن سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر لی۔ اس پہلی عورت کے ساتھ ایک بکس(Box) تھا جس کو فرضی طور پر پاونڈرا بکس کہا جاتا تھا۔ پاونڈرا نے زمین پر قیام کے بعد ایک روز بکس کھول دیا اس بکس کے اندر ہر قسم کی برائیاں بھری ہوئی تھیں اور بکس کھلتے ہی تمام برائیاں زمین پر پھیل گئی اور اس کے بعد یہ برائیاں زمین سے ختم نہ ہو سکی۔[۱۲] طبقہ اشرافیاں اور متوسط طبقے کی یونانی عورت زنان خانے میں اور کڑے پردے میں زندگی گزاری تھی۔ عورتیں گھر سے باہر تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔ عورت گھر میں مہانوں کے سامنے نہیں آتی تھی اور نہ کسی کے آنے پر دروازہ کھولتی تھی مگر عورتوں کا علیحدہ حصہ ہوتا تھا۔ جس معاشرے میں گھریلو خواتین پر سختی ہو اور انھیں پردے میں رکھا جائے وہاں طوائفیں اور داشتائیں آزاد ہوتی ہیں جو مردوں کے ساتھ محفلوں میں جاتی ہیں اور ان کے ذوق کی تسکین کرتی ہیں۔ یہی صورت حال یونان کی تھی جہاں طوائف کی حیثیت آزاد عورت کی تھی جو یونان کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جان تھی۔ رنڈی کا کوٹھا یونانی معاشرے کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ فلاسفر، شعراء، مورخین، اہل ادب اور ماہرین فنون غرض تمام سیارے اسی افتاب کر گرد گھومتے تھے وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں میں صدر نشین تھی بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اسی کے حضور میں طے ہوتے تھے۔[۱۳]

iii. رومی

یونانیوں کے بعد جس قوم نے عروج حاصل کیا وہ اہل روم تھے مگر ابتداء میں عورت کا سماجی مرتبہ رومیوں کے ہاں گرا ہوا ہی تھا اور اس کا سب سے بڑا کام یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرے۔ انھوں نے مردوں کو اس قدر حقوق دے رکھے تھے کہ خاندان کا سربراہ مرد ہوتا تھا جو خاندان کے سیاہ و سفید کا مالک تھا یہاں تک کہ اگر بیوی کو قتل بھی کر دے تو کوئی مقدمہ نہیں بن سکتا تھا۔ بلکہ یہ اس کا حق تصور کیا جاتا تھا عورت بالکل مرد کے زیر اثر تھی اس لیے پلوٹاک شوہر کو نصحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ بیوی کو اپنی نگرانی میں رکھے ورنہ وہ بے کار کی عادتوں کا شکار ہو جائے گی۔ اسے ساتھ میں کھانا کھلائے ورنہ وہ اکیلے میں بہت کھائے گی شوہر کے دیوتاؤں کی عبادت کرے ورنہ توہمات میں مبتلا ہو جائے گی۔[۱۴] تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل روم کا نظریہ عورت کے بارے میں بدلتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ نکاح و طلاق کے قوانین اور خاندانی نظام کی ترکیب میں اتنا تغیر پیدا ہوا کہ صورت حال بدتر ہو گئی اور رومی سلطنت عیاشیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ رومی ادب میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان ہوئے تھے اور عوام و خواص میں وہی ادب مقبول ہوتا تھا جس میں استعارہ و کنایہ کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔

جاوید رومی تہذیب کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتی ہیں کہ یونان فتح کرنے کے بعد روم میں خوش حالی بڑھ گئی تھی دولت کی فراوانی نے خوشحال عورتوں کے اطوار بگاڑ دیے۔ اونچے گھرانے میں شادیاں دولت اور ریاست کے تابع ہو گئی عورتوں کو شادی میں کوئی دلچسپی نہ رہی انہوں فلسفہ اور ادب پڑھنا شروع کر دیا، مقرر بن گئیں، گانا اور ناچنا اپنا مشغلہ بنالیا۔[۱۵] روم میں اخلاق و معاشرت کے بند ڈھیلے ہونے اور دولت کی فروانی کی وجہ سے شہوانیت، عریانی اور خواہش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی اور عریانی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور فحش تصویریں گھروں کی زینت بننے لگیں قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ ملا کہ معزز خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنا پڑا۔

iv. یہودیت

یہودیت کے آتے آتے عورت سماجی طور پر بالکل گر چکی تھی یہودیوں میں عورت کی حیثیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بیوی کو ہدایت کی گئی کہ اس کی ہر خواہش اس کے خاوند کے لیے ہو اور اپنے شوہر کو اپنا مالک سمجھے توریت میں شوہر سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ایسے خطاب کرے جسے مالک غلام سے اور بادشاہ رعیت سے کرتا ہے۔ شوہر کو یہ اختیار تھا کہ وہ جب چاہیے بیوی کو طلاق دے دے مگر عورت کو مرد سے علیحدگی کا کوئی

حق نہیں تھا اگر عورت سے بے وفائی ہو جائے تو اُسے سنگین جرم سمجھا جاتا تھا اگر اس پر زنا ثابت ہو جاتا تو اسے سنگسار کر دیا جاتا تھا اگر بچہ پیدا نہ ہوتا تو اس کی ساری ذمہ داری عورت پر آجاتی تھی۔ باپ کو یہ حق تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو فروخت کر دے۔ یہودی مرد کی یہ دعا ہوتی کہ خدا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے عورت نہیں بنایا۔[۱۶] یہودیوں میں ایسے فرقے بھی تھے جن کی آبادیاں مردوں کے لیے مخصوص تھی اور وہ خواتین سے دور رہتے تھے۔ ان کے مطابق عورت شہوت پیدا کرتی ہے اور جھگڑے کا سبب بنتی ہے۔ عورت کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس کو پڑھانا نہیں چاہیے۔ یہودیوں میں جہاں غیر یہودیوں سے شادی ممنوع تھی وہیں قریبی رشتہ داروں سے بھی شادی کی مخالفت کی جاتی تھی۔ ان کے ہاں عورتوں کو ناپاک سمجھ کر علیحدہ رکھا جاتا تھا اور ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا بھی نہیں کھایا جاتا تھا ان کے مطابق عورت کی مغفرت اسی میں ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرے۔

v. عیسائیت

عورتوں کے بارے میں یہی خیالات عیسائیت میں تھے ان کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے۔ یہ مرد کے لیے جہنم کے دروازے کی مانند ہے اور عام انسانی مصائب کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ عورت کو اس مقام پر لا کر کھڑا کیا کہ اس کا عورت ہونا ایک شرمناک فعل ہے اور اس کا حسن و جمال شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ٹرٹولیاں (Tertullian) جو ابتدائی دور کے آئمہ مسحیت میں سے تھا عورت کے متعلق مسیحی تصور کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے وہ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی خدا کے قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر مرد کو غارت کرنے والی ہے۔[۱۷]

عورت کی پسماندگی کو بڑھانے میں چرچ کے اولیا نے زیادہ کردار ادا کیا اور انہوں نے عورت کی حیثیت کو سطحی کمزور اور اسے دماغی طور پر غیر مستقل مزاج قرار دیا۔ عورت کی صحیح تربیت کے لیے عیسائیت کے مذہبی علماء یہ سمجھتے تھے کہ اسے ہر قسم کی محفل سے دور رکھا جائے کیونکہ یہ سماجی اور ثقافتی مواقع اسے آزاد خیال اور بے باک بنا دیتے ہیں۔ چرچ کی جانب سے عورت کی برائیاں اس قدر بیان کی گئی کہ نفسیاتی طور پر عورت خود اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگی اس خیال سے کہ وہ برائی، خرابی اور گناہ کی وجہ سے اور دنیا میں تمام برائیاں اس کی وجہ سے ہیں اور اسی کا کفارہ ادا کرنے میں لگی رہی اور صورت حال یہ ہو گی کہ وہ اپنی خوبصورتی اور اپنے لباس اور اپنی زینت پر شرمندہ ہونے لگی کیونکہ وہ خیال کرنے لگی کہ اس گناہ کی طرف لوگوں کو راغب کیا جاتا ہے کلیسا کے عہدار یہ خیال کرتے تھے کہ عورت کے چہرے میں گناہ کا بہت بڑا خطرہ ہے اس لیے وہ عورت کی موجودگی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے اس سے بات چیت کرنے سے اجتناب کرتے اور عورت کو برائی اور فساد کی جڑ سمجھتے ہوئے اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے اور اس سے جتنا دور رہتے اتنا ہی خود کو رومانی طور پر افضل و برتر سمجھتے تھے۔

vi. ہندو مذہب اور تہذیب میں عورت

ہندوستانی تہذیب بھی دنیا کی قدیم تہذیبوں میں سے ہیں جو اپنی الگ تاریخ رکھتی ہے عام طور پر ہندوستان کی تاریخ کو ویدوں کے دور سے شروع کیا جاتا ہے لیکن آثار قدیمہ کی دریافت نے دراوڑی دور کی بھی خصوصیات اجاگر کی ہیں۔ مذہبی کتابوں اور آثار قدیمہ کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں بھی دوسری تہذیبوں کی طرح شروع میں مادر سری نظام رائج تھا ہندوستان کی مقامی قدیم قوم دراوڑ ہے جن کے ہاں عورت کو کافی بلند درجہ حاصل تھا۔

اس مادر سری نظام میں دھرتی کو ماں کا درجہ حاصل تھا۔ ہندو مائتھالی جی میں دنیا کو تخلیق کرنے والی پراکرتی مقدس دیوی تھی جیسے شکتی دیوی بھی کہا جاتا ہے قدیم ہند میں شرمت[۱۸] دور عورت کی سربراہی کا دور تھا جیسا کہ قدیم بابلی تہذیب میں عورت نے جادو توہمات کو فروغ دیا۔ اس قدیم ہندوستان میں عورت نے مردانہ نظام سے تحفظ کے لیے تنتر ازم کو فروغ دیا۔ تنتر مائتھالوجی میں دیویاں تخلیق ہوئیں لہذا تنتر ازم میں عورت مقدس تھی اور پیدائش کا سرچشمہ تھی۔

عورت کی سماجی حیثیت گرنا اس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان میں آریاؤں کا تسلط شروع ہوا۔ آریاؤں نے مہابھارت جنگ میں فتح پانے کے بعد دراوڑوں کو یرغمال بنا کر شادیاں کیں۔ اس طرح دراوڑی معاشرے کی روایات کمزور ہو گئیں جس کے نتیجے میں دیویاں تو باقی رہ گئی مگر عورت کی حیثیت کم تر ہوتی چلی گئی اور مرد برسر اقتدار آتے چلے گئے۔ ڈاکٹر عقلیہ جاوید کے بقول عورت راج میں مردوں کی بالادستی ختم کرنے کے لیے دیویوں کے چرنوں میں لڑکوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ اور عورتوں کی مخصوص عبادت گاہوں اور طلسم کدوں میں مردوں کو خصی ہو کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ عورت راج میں عورت کی قربانی منع تھی۔ نتیجتاً جب مرد اقتدار میں آئے تو انھوں نے کم سن لڑکیوں سے شادی اور ستی کو رواج دے کر بدلا چکایا اور مندروں میں دیوداسی نظام کو پروان چڑھایا۔[۱۹]

ہندو کی مقدس کتاب "رگ وید" اور "منو سمرتی" ہیں ان قدیم کتابوں میں عورت کے حالت کے بارے میں تضاد ملتا ہے جیسے رگ وید سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں تعلیمی اعتبار سے عورتیں قریب قریب مردوں کے برابر تھیں۔ وہ مذہبی امور آزادانہ ادا کر سکتی تھیں۔ لڑکی کی پسند کی شادی کو اہمیت دی جاتی تھی اسی سماجی حیثیت تک پہنچنے کے بعد "رگ وید" کے ہی زمانے میں اس کی اہمیت گرنے لگی اور نہ صرف اس کی سماجی حیثیت ختم ہوئی بلکہ ان کو وید پڑھنے تک سے روک دیا گیا۔ مہابھارت میں کہا گیا ہے کہ دنیا میں عورت سے زیادہ گناہ گار چیز کوئی نہیں ہے عورت تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اس ہندو تہذیب میں جہاں اسے برائی کی جڑ کہا گیا ہے جتنی دیویوں کا ذکر ملتا ہے شاید کسی مذہب میں نہیں۔

آریاؤں کی آمد سے پہلے اور برہمن راج سے پہلے ہندوستان میں عورت انتہائی مقدس ہستی تھی اور معاشرے میں اس کی حیثیت کافی بہتر تھی مگر برہمن راج میں عورت کا درجہ کم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے۔ مثلاً وراثت میں انھیں غیر مستحق قرار دیا گیا۔ بیوہ کی دوسری شادی پر پابندی لگائی گئی۔ جس کے نتیجے میں ستی جیسی بیہمانہ رسم پروان چڑھی اور ستی کے نتیجے میں کم سن بچیوں کی شادی کے رواج نے فروغ پایا۔ کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد جب ماں ستی ہو جاتی تھی لڑکی کی دیکھ بال اس کے سسرال والے کرتے تھے۔ ہندو مہذب میں عورت ایک طرف تو دیوی بھی تھی تو دوسری طرف وہ پاؤں کی جوتی بھی تھی۔

یہاں ایک سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قدیم ہندوستان میں عورت کے یہی دو انتہائی تصورات موجود تھے۔ یا ان دو انتہاؤں کے درمیان بھی عورت کی کوئی تصویر ملتی ہے۔

مہابھارت میں کہا گیا ہے کہ دنیا میں عورت سے زیادہ گناہ گار چیز کوئی نہیں ہے عورت تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اس ہندو تہذیب میں جہاں اسے برائی کی جڑ کہا گیا جتنی دیویوں کا ذکر ملتا ہے شاید کسی مذہب میں نہیں۔[۲۰] آریاؤں کی آمد سے پہلے اور برہمن راج سے پہلے ہندوستان میں عورت انتہائی مقدس ہستی تھی اور معاشرے میں اس کی حیثیت کافی بہتر تھی مگر برہمن راج میں عورت کا درجہ کم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے۔ مثلاً وراثت میں انھیں غیر مستحق قرار دیا گیا۔ بیوہ کی دوسری شادی پر پابندی لگائی گئی۔ جس کے نتیجے میں ستی جیسی بہیمانہ رسم پروان چڑھی اور ستی کے نتیجے میں کم سن بچیوں کی شادی کے رواج نے فروغ پایا۔ کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد جب ماں ستی ہو جاتی تھی لڑکی کی دیکھ بال اس کے سسرال والے کرتے تھے۔ ہندو مہذب میں عورت ایک طرف تو دیوی بھی تھی تو دوسری طرف وہ پاؤں کی جوتی بھی تھی۔

vii. اسلام میں عورت کا تصور

مختلف مذہب اور تہذیب و تمدن کی روشنی میں اب تک عورت کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت برائی کی جڑ ہے اور اس کا وجود ہی گناہ کا مرکز ہے جب کہ مرد معصوم ہے وہ تو عورت ہی ہے جو اسے برائی کے راستے پر ڈالتی ہے۔ مختلف تہذیبوں اور معاشرے میں عورت کا انتہائی متضاد تصور ملتا ہے کہیں وہ دیوی بنا کر اس کی پوجا کی جاتی ہے اور اس کے قدموں میں قربانیاں دی جاتی ہیں اور اس کی حیثیت کو بڑھا کر اسے مافوق الفطرت عناصر میں شامل کر دیا جاتا ہے اور کہیں اس کی حیثیت اتنی گرا دی جاتی ہے کہ اسے پاؤں کی جوتی سے تشبیہ دی جاتی ہے اور خاوند کے مرنے کے بعد اس کی زندگی کا حق بھی چھینا جاتا ہے اور اسے ستی پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی تہذیب و مذہب نے عورت کو وہ مقام و مرتبہ دیا جو نہ صرف باقی

مذاہب اور تہذیب و تمدن کے مقابلے میں مثالی تھا بلکہ موجودہ دور بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام نے عورت کی فطرت کے مطابق اس کو جو دیا ہے کچھ ادیان کے مطابق حضرت آدمؑ کو جنت سے نکالنے کا باعث بھی عورت (اماں حوا) ہی بنی۔ یعنی اماں حوا شیطان کے بہکاوے میں آئی اور اس نے حضرت آدم کو کو بھی گمراہ کیا۔ اس واقعہ کو قرآن پاک بھی بیان کرتا ہے مگر کہیں بھی نہ اماں احوا کو حقیقی ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور نہ بالکل بری ذمہ قرار دیتا ہے بلکہ جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

اسلام نے عورت کو بہت حقوق دیے اسلام سے پہلے عربوں کے ایک قبیلے میں یہ رواج تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی زندہ در گود کرتے تھے۔ جب کہ اسلام نے بیٹیوں کے قتل کو گناہ ٹھہرایا اور اس جاہلانہ رسم کے خاتمے کے لیے باقاعدہ آیات نازل ہوئیں۔

ترجمہ: ''اور جب زندہ گاڑھی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس گناہ میں قتل کی گئی''۔[۲۱]

وارثت کے حوالے سے بھی اسلام نے عورت کو محروم نہیں کیا اور باپ اور شوہر کی جائیداد میں عورت کو حقدار بنایا ہے سورۃ النساء آیت نمبر ۷ میں ہے۔

ترجمہ: '' مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو''۔[۲۲]

کسی فعل کی سزا کے معاملے میں بھی اسلام نے مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں رکھی اور نہ ہی غلطی پر سزا کا مستحق دوسرے کو قرار دیا ہے۔

روحانی ترقی اور اخلاقی نشوونما کے دائرے میں عورتوں کو مادی رتبہ دیتے ہوئے ہر عظیم شخص کے ساتھ قرآن نے ایک عظیم عورت کا ذکر بھی کیا ہے۔ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی بیویوں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی ماؤں کا تذکرہ قرآن پاک انتہائی ادب و احترام کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر قرآن نے حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی بیویوں کو بطور نافرمان کے ذکر کیا ہے تو اس میں فرعون کی بیوی کا بھی ذکر ہے جو نافرمان اور ظالم شوہر کے ساتھ فرمانبردار اور متقی عورت تھی۔

اسلام میں عزت وبڑائی اور مرتبے کا معیار صنفی امتیاز میں نہیں رکھا گیا بلکہ پرہیز گاری اور تقویٰ کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والا یا بہترین انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے نہ ہی مرد عورت سے بہتر ہے اور نہ ہی عورت مرد سے بلکہ بہتر وہ ہے جس کے اعمال بہتر ہیں۔

آج بھی مذہب کوئی بھی ہو عورت صرف عورت ہے اور اس سماجی حیثیت تقریباً یکساں ہے۔ رفتہ رفتہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ عورتوں نے یہ احساس کرنا شروع کیا کہ عورتیں معاشرے کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہیں جتنے کہ مرد تو پھر ان کو معاشرے میں مردوں جیسا ہی ادب و احترام ملنا چاہیے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ حقوق نسواں کی تحریک کا آغاز اس دن ہوا تھا جب عورت کو شدت سے احساس ہوا تھا کہ اسے معاشرے میں کم درجہ حاصل ہے۔ تحریک نسواں نے مختلف ادوار میں مختلف روپ دھارے ہیں۔ عورتوں نے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے کر معاشرے میں اپنی حیثیت موانے کا آغاز کیا۔

چنانچہ تانیثیت کی تحریک کا آغاز اور اس کی پہلی آواز مغرب میں سنائی دی جب عورتوں کے مسائل سیاسی اور مذہبی حلقوں میں زیر بحث آنے لگے اور وہ تحریریں سامنے آئیں جنھوں نے بیسوی صدی تک آتے آتے ذہنوں کو تبدیل کر دیا۔

viii. مغرب میں تانیثیت کی تحریک

پوری مغربی تاریخ کو دیکھا جائے تو عورتیں محدود ہیں گھر کی چار دیواری میں جب کہ عام معاشرتی زندگی مخصوص تھی صرف مردوں کے لیے اور یہ چیزیں اور رویے ہی تحریک نسواں کا محرک بنے۔ تیسری صدی عیسوی میں رومن خواتین کیپٹولائن ہیل (Capitoline Hill) میں جمع ہوئیں اور انہوں نے تمام راستے بند کر دیے اور اس بات پر احتجاج کیا کہ خواتین کو مہنگی اشیا استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ پہلی آواز تھی جو عورتوں نے اپنے حق کے لیے مغرب میں کی۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں مختلف خواتین نے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ گیارہویں صدی میں انگلستان کی ایک نن ہلڈیگرڈ پہلی مرتبہ ایک معروف مذہبی مبلغ کے طور پر سامنے آئی اور تبلیغی مقصد کے لیے جرمن سلطنت کا دورہ کیا۔ اپنی اعلی تعلیم کے باوجود اپنے عہد کے رائج نظام اقدار سے اس قدر خائف تھی کہ کبھی کبھی اپنی غیر نسائی سرگرمیوں یعنی تصنیف و تالیف اور موسیقی کے ذوق کے باعث احساس جرم میں مبتلا ہو جاتی یہاں تکہ کہ ایک بار اسے ایک کلیسائی عالم کو خط لکھ کر پوچھنا پڑا کہ اسے اپنی تصنیف و تالیف جاری رکھنی چاہیے یا ترک کر دینی چاہیے۔[۲۳] یہ وہ دور تھا جب خواتین نے اپنے حقوق کے لیے کوشش شروع تو کر دی تھی۔ مگر بعض اوقات اپنے نظام اقدار سے خوفزدہ بھی تھی کیونکہ ان کی مخالفت کے پہلو بھی تھے۔

چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں فرانس کی پہلی تانیثی مفکر کرسچن ڈیڈ پی سان (Christine Dedpisen) نے عورتوں کے حقوق اور تعلیم نسواں کی آواز بلند کی۔ اس کی اس آواز کو بعد میں لارا سریٹا (Laura Cerata) نے فرانسیسی میں اپنے خطوط 1488! Collected letters of a renaissance feminist episotloc famliares Eng. Trans کے ذریعے مزید تقویت دی۔ ان خطوط میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں شکایتوں، جہالت اور شادی شدہ عورتوں کے ساتھ رکھے گے جبری رویوں کے خلاف آواز اُٹھائی گئی۔[۲۴]

سولہویں صدی عیسوی تک اور بھی کئی خواتین لکھاریوں نے حقوق نسواں کے لیے کام کیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں اطالوی مصنفہ (Moderata Fonte) نے اپنے مضمون The worth of women میں عورتوں کے حقوق کو واضح انداز میں متعارف کروایا۔ ۱۸۵۹ء میں جین اینگر (Jane Anger) نے اپنا مضمون Her protection for women شائع کر کے انگلینڈ میں تانیثیت کی راہ ہموار کی اور ایک صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک اور خاتون میری آسٹل (Mary Astell) نے اپنی کتاب A serious proposal to the ladies (1694-1697) دو جلدوں میں لکھی جس میں اس نے یہ تجویز دی کہ مذہبی طور پر ایسی جگہیں ہونی چاہیے جہاں عورتیں رہ کر پڑھ سکیں اور پڑھا سکیں۔[۲۵] روشن خیالی کے دور میں خواتین نے عورتوں کے لیے کھل کر کام کرنا شروع کیا۔ خواتین نے آزادی، برابری اور مساوی حقوق کے لیے تحریک تیز کر دی۔ روشن خیالی کے ابتدائی دور میں مرد مفکرین نے عورت کو بے وقوف گردانا، مردوں سے کمزور اور کم تر پیش کیا اور عورتوں کی شخصی آزادی کی مخالفت کی جس میں روسو جیسے مفکر بھی سہر فہرست ہیں۔ اس دور کی خواتین لکھاریوں نے عورتوں کے ساتھ روا غیر منصفانہ سلوک اور استحصالی رویوں کے خلاف کھل کر لکھا۔ جیسا کہ اولمپی ڈی گوجز (Olmpe De Gouges) مشہور ڈرامہ نگار نے ۱۷۹۱ء میں Declaration of the right of women and of the female citizen لکھ کر اس بات کو واضح کیا کہ عورتیں نہ صرف برابر ہیں بلکہ ان کی ساتھی بھی ہیں۔ اس سے اگلے سال ۱۷۹۲ء میں میری وال سٹون کرافٹ (Mary wall stone craft) نے A vindication of the rights of women لکھ کر اس تصور کو کھلا چیلنج کیا کہ عورتیں مردوں کے برابر ہیں انہیں حصول تعلیم کے لیے کام کرنے کے لیے اور سیاست میں حصہ لینے کے لیے برابر مواقع میسر ہونے چاہئیں۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ عورتیں اگر بے وقوف اور کم تر ہیں تو اس معاشرے کا اہم کردار ہے جو کہ ان کی تربیت اسی انداز سے کرتا ہے۔[۲۶]

اس کے بعد آزادی نسواں کی یہ تحریک روز بروز زور پکڑتی گئی۔ انیسوی صدی میں منظم انداز میں خواتین نے تحریک نسواں کے لیے کام کیا۔ اس دور میں تحریک نسواں کی آگاہی مردوں اور عورتوں میں پھیلی عورتوں کے لیے حصول تعلیم کے مواقع، گھر سے باہر کام کرنا، ووٹ دینے کا حق اور قوانین کی تبدیلی نے شادی شدہ عورتوں کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ۱۸۴۳ میں میرین ریڈ(Marion Reid)نے اپنا مضمون A plea) (for women شائع کیا جو کہ میری وال سٹون کرافٹ کی(Vindication)کے بعد سب سے مستند مضمون تھا اس میں میرین ریڈ(Marion Reid)نے عورتوں کے حقوق کے مختلف پہلوؤں پر کھل کر لکھا۔ شادی شدہ خواتین کی حالات زندگی کو مفصل انداز میں پیش کیا کہ وہ کس طرح اپنے شوہروں کی خدمت اور بچوں کو صاف ستھرا رکھتی ہیں۔ اس تحریک نے مردوں کو بھی اپنا حامی بنا لیا اور انہوں نے بھی باقاعدہ عورتوں کے حق میں مضامین لکھے۔ ان میں نمایاں نام ولیم تھامسن(William Thompson)اور جان سٹورٹ مل Jan Stuart) (Millہیں۔[۲۷]

انیسویں صدی کے شروع میں خواتین کے ووٹ کا حق تحریک نسواں کا ایک اہم جز بن گیا اس حق کو حاصل کرنے کے لیے خواتین نے بہت زیادہ جدوجہد کی اور انہیں بہت زیادہ مسائل اور مصائب جھیلنا پڑے۔ ۱۸۲۵ء میں ولیم تھامسن جو کہ اینا ویلر(Anna Wheeler)سے متاثر تھا سلسلے میں باقاعدہ جدوجہد کا آغاز کیا۔

۱۸۴۷ء میں An Elderly Quaker اور عین نائٹ(Anneknight)نے خواتین کے حقوق کے متعلق ایک اشتہار شائع کیا۔ ہیرٹ ٹیلر(Harriet Tayler)جو کہ بعد میں جان سٹورٹ مل کی بیوی بنی اسی نے ۱۸۵۱ء میں West minste review میں عورتوں کے ووٹ دینے کے حق پر سیر حاصل بحث کی۔ ۱۸۶۹ء میں جان سٹورٹ مل نے خود The subjection of women میں اس نے اس بات کا اظہار کیا کہ عورتیں مردوں کے برابر ہیں اور انہیں ووٹ دینے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ ۱۸۷۰ء تک ایک تہائی جوان مردوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ ۱۸۸۴ء میں (Reform act)۶۲ فیصد سے ۶۸ فصد تک مردوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا لیکن عورتیں اس حق سے محروم تھیں۔ اس کے بعد حق خودارادیت کا مطالبہ جوں جوں بڑھتا گیا تو بحث شروع ہو گئی کہ ووٹ کا حق صرف غیر شادی شدہ کو ہونا چاہیے۔ کیونکہ شادی شدہ عورت کی تمام تر دلچسپیاں اپنے شوہر کی خواہش کے مطابق ہوتی ہیں اگر شوہر کو حق حاصل نہیں تو بیوی کی بھی وہی رائے ہو گی۔[۲۸] باربرا لے اسمتھ(Barbara leigh smith)نے خواتین کے ساتھ مل کر ۱۸۶۶ء میں عورتوں کے حق خودارادیت کی تحریک کی قرار داد جمع کروائی جس پر ۱۴۹۹ عورتوں کے دستخط تھے۔ اسی طرح کی ایک اور قرار داد ایملی

ڈیویزEmily Davies نے جان سٹورٹ مل کو دی اور اس نے اسے ۴جون ۱۸۶۶ میں اسمبلی میں جمع کروایا۔ ۱۹۴ارکان میں ۷۳ نے اسی قرارداد کی حمایت کی اور باقی نے مخالفت کی۔ لہذا اس کو بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ اس سلسلے میں ایک اچھا آغاز ثابت ہوئی۔[۲۹]

۱۸۹۰ء تک مردوں کے حق خودارادیت میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اس پر عورتوں نے آواز بلند کی کہ مرد جو ناخواندہ اور غریب ہیں ان کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور خواندہ عورتیں جو ٹیکس بھی ادا کرتی ہیں اس حق سے محروم ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں ایک اور قرارداد اسی سلسلے میں جمع کرائی گئی اس کو کافی حد تک پذیرائی ملی۔ خواتین کو ووٹ کا حق تو نہ مل سکا لیکن حوصلہ افزائی ضرور ہوئی۔[۳۰] بیسویں صدی کے اوئل سے بھی عورتوں نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ جلسے جلسوں کا آغاز کیا۔ خواتین کی مختلف تنظیمیں جو اس مقصد کے لیے کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی۔ پہلی جنگ عظیم نے عورتوں کا کام اور آسان کر دیا اور وہ گھر سے باہر کے کاموں میں مزید بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔ ۱۹۱۸ء میں تیس سال کی عمر کی خواتین کو ووٹ دینے کا حق مل گیا اور مارچ ۱۹۲۸ء تک عورتوں کو یہ حق مردوں کے برابر مل گیا۔[۳۱]

جنگ عظیم دوم کے بعد سائمن دی بوائر کی کتاب The second sex سامنے آئی جو تانیثیت کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہیں۔ سائمن نے عورت کے وجود سے متعلق متعدد مباحث چھیڑے مثلاً یہ کہ عورت کیا ہے؟ کیا عورت کا وجود قائم بالذات ہے یا پھر اضافی؟ کیا جنس مخالف کی موجودگی سے ہی اس کے وجود کا تعین ہو سکتا ہے؟ اور اگر تذکیر کے بغیر تانیث کا تصور ممکن نہیں تو پھر اس قاعدے سے تانیث کے بغیر تذکیر کا صیغہ بھی مہمل ہے تو پھر ایسا کیوں ہے عورت ہی مرد کی نسبت پہنچانی جاتی ہے اور مرد کے لیے عورت کی نسبت سے پہچانا جانا انتہائی ذلت کی بات سمجھی جاتی ہے۔ سائمن کی تحریروں نے تانیثیت کی بحث کو بہت تقویت دی اور اس کا رشتہ مختلف پہلوؤں سے جوڑ دیا"۔[۳۲]

اس کے علاوہ جوڈتھ مول، ایلین لیوں اور جو فریمین وہ عورتیں ہیں جنہوں نے عورتوں کی تاریخ پر مضامین اکٹھے کیے۔ سٹینسٹن نے ۲۳ عورتوں کے ساتھ مل کر عورت کی انجیل (The women Bible) مرتب کی جس میں عورتوں کے نقطہ نگاہ کو پیش کیا گیا۔[۳۳] مغربی معاشرے کی یہ تانیثیتی سوچ کسی نہ کسی شکل میں ہندوستان پہنچی اور یہاں کے معاشرے پر اثر انداز ہوئی۔

ix. اُردو ادب میں تانیثیت

ہندوستان میں تانیثیت کی یہ تحریک مغرب سے آئی اور پوری شدومد کے ساتھ ہندوستان کے بڑے بڑے علمی گھرانوں سے ہو کر متوسط طبقے میں بھی پھیلنی شروع ہو گئی مگر اس باقاعدہ تحریک سے قبل بھی یہاں کی عورتوں میں کچھ نہ کچھ شعور و آگاہی کا مادہ موجود تھا۔ چنانچہ تحریک نسواں اور تعلیم نسواں کا نقطہ آغاز رشدۃ النساء کے ناول اصطلاح النساء(۱۸۸۱ء) کو مانا جاتا ہے۔ نذیر احمد (۱۸۳۰ء تا ۱۹۱۲) کے ناول اگر تحریک نسواں اور تعلیم نسواں کا نقطہ آغاز ہیں تو رشید النساء کا ناول اصطلاح النساء اس تحریک کا پہلا ثمر اور نثر میں نسوانی ادب کا نقطہ آغاز ہے"۔(۳۴)

اس دور کے سب سے بڑے رہنما اور مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھانے والے سر سید احمد خان جنہوں نے مسلمانوں کی جدید علمی ترقی کے لیے بہت کام کیا وہ بھی عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے یہ نظریہ رکھتے تھے کہ:

> "جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے وہ غلطی پر ہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہو گی جب تک اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں"۔(۳۵)

لیکن رشیدۃ النساء نے "اصلاح النساء" میں اس کے برعکس کہا ہے۔ ان کا نقطہ نظر سر سید سے مختلف تھا۔ وہ لکھتی ہیں۔

> "مرد کی تعلیم عورت کے اختیار میں ہے جب لڑکے پیدا ہوئے ہیں تو پہلے ماں سے تعلیم پاتے ہیں بعد اس کے مولوی ماسٹر کے سپرد ہوتے ہیں"۔(۳۶)

امداد امام بخش اثر کی بہن رشیدۃ النساء اپنے زمانے کی ان چند پڑھی لکھی اور باشعور خواتین میں سے تھیں جنہیں نہ صرف اپنے زمانے کی بل کہ مستقبل کی جھلک بھی دکھائی دینی شروع ہو جاتی ہے۔ لہذا ان کی دور بین کی نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ اب ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ لہذا انہوں نے خواتین کے لیے ایک مدرسہ قائم کرنے کے بارے میں سوچا۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ایک زنانہ مدرسہ "مدرسہ اسلامیہ" قائم کیا گیا۔

مغربی لوگوں نے مشرق میں تعلیم نسواں پر بھرپور توجہ کی ہے۔ ابتدائی ہندوستانی دور پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ جتنے بھی اہم کام اس حوالے سے ہوئے ان کے پیچھے انگریزوں کا ہاتھ کار فرما تھا۔ انہوں نے تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی۔ اس ضمن میں پہلا شخص ڈیوڈ ہیر نظر آتا ہے۔ جس نے ۱۸۲۰ میں بنگالی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انجمن اطفال کلکتے میں قائم کی۔

پھر ۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے تعلیم نسواں کی طرف توجہ دی۔[۳۷] یہ وہ زمانہ تھا جب معاشرے میں بیداری تو پیدا ہو رہی تھی لیکن دوسری جانب ایسے ایسے اشخاص موجود تھے جو خود تو طوائف کی علمیت سے متاثر تھے لیکن اپنی عورتوں کو تعلیم دینا وہ اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ زنان خانے کو آباد کرنے اور صحیح النسب اولاد پیدا کرنے کی ذمہ دار اگر پڑھ لے گی تو عشق و عاشقی اور فسق فجور کسی طرح دامن نہیں بچا سکے گی۔[۳۸] مردوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی عورتیں ان پڑھ ہونے کے سبب خود تعلیم کے فوائد و ثمرات سے ااگاہ نہیں تھیں ان کے نزدیک لڑکیوں کو تعلیم دلانا ان کو اور دلیر کرنا ہے۔

جاگیر دارانہ اور پدر سری نظام کے ساتھ جہالت اور تعلیم نسواں کے اقتدار نے عورتوں کی صلاحیتوں او رشعور کو بیدار نہیں ہونے دیا مگر انیسویں صدی کے اوخر میں کچھ طبقات میں تعلیم نسواں پر توجہ دی جانے لگی۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں پہلی مرتبہ ہندوستانی عورت گریجویٹ ہوئی اور ۱۸۹۳ء میں پہلی بار ہندوستانی عورت ڈاکٹری پڑھنے کے غرض سے آکسفورڈ گئی۔[۳۹] سرسید تحریک نے جہاں سیاسی اور سماجی طور پر اثرات مرتب کیے وہیں عورتوں کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ پہلے مردوں کی تعلیم ہو پھر عورتوں کی۔ تعلیم نسواں کے متعلق سرسید کے خیالات وہی تھے جو اس وقت عام مسلمانوں کے تھے۔[۴۰] اس وقت ہندستان میں عورتوں کی تعلیم دو طرح کی تھی یا اس کے دو درجے متعین کیے جاسکتے تھے۔ ایک طرف ہندو طبقہ جو عورتوں کو کسی حد تک تعلیم دے رہا تھا اور کچھ مسلمان بھی اس طبقے کی نمائندگی کے لیے منتخب کیے جاسکتے ہیں جو تحریک تعلیم نسواں کے لیے اہم ہیں۔ ان میں سرسید اور ان کے ارفقاء کار حالی، نذیر احمد، شبلی مولوی ذکا اللہ محسن الملک وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

شیخ عبد اللہ کا رسالہ ''خاتون'' بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ یہ مسلمان خواتین کی تعلیم و تربیت سے متعلق تھا۔ دوسرا درجہ ان مسلمانوں کا تھا جو عورتوں کے لیے تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے لیکن صرف مذہبی تعلیم۔ وہ عورت کی دنیاوی تعلیم کے خلاف تھے وہ عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود سمجھتے تھے۔ لہذا عورت کو صرف اتنی تعلیم ہونی چاہیے کہ وہ گھر کی دیکھ بھال اور شوہر کی خدمت کر سکے۔ اس زمانے کی عورت کو ہر ممکن طریقے سے انگریزی تعلیم سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن بیسویں صدی میں تحریک نسواں کے پھیلنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے یہاں عورتوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ انگریزی حکومت کی حکمت عملی میں اس بات کو خاص اہمیت حاصل تھی کہ عورتوں میں تعلیم کو عام کیا جائے۔ اس غرض کے لیے حکومت نے تقریر و تحریر کے وسائل اور ذرائع اختیار کیے۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر میکلوڈ رائٹ اور ناظم تعلیم میجر پال وائٹ اور یو۔ پی کے گورنر سر ولیم میور اور ڈائریکٹر تعلیمات میکس کی خدمات اس سلسلے میں نہایت اہم ہیں۔ یہ

انگریز حکام البتہ علوم شرقیہ کے بڑے قدر دان تھے اور اپنی اُردو نوازی میں مصروف تھے۔ ان حکام نے سکولوں کے لیے معیاری نصابی کتب اور تراجم تیار کروائے اور تعلیم نسواں کے لیے خصوصی کتابیں لکھوائیں جو بچیوں اور نوجوان خواتین کے مطالعے کے لیے زیادہ موزوں، دلچسپ اور سبق آموز تھیں۔[۴۱]

وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری بڑھتی گئی ویسے ویسے تحریک تعلیم نسواں بھی پنپتی چلی گئی۔ تعلیم نسواں کی تحریک نے عورتوں میں شعور بیداری کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔

عورتوں کو نہ صرف تعلیم سے دور رکھا گیابلکہ ان جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ بیوہ عورت کی معاشرے میں کوئی عزت نہ تھی۔ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا۔ اور اپنی ذاتی تسکین کے لیے عورتوں کو گھر میں باندی بن کر رکھنے کا رواج تھا ثاقب رزمی "آزادی نسواں کا نیا سویرا" میں لکھتے ہیں۔

> " یہ کتنی اندوہ گیں روش ہے کہ عورتوں کو برائے تسکین حظ جنسی گھروں میں پودوں کی چارپایوں کی طرح قید بنا رکھا ہے اور ان کو انسانیت کے ارفع مقام سے بھی گرا دیا ہے وہ عورتیں جو اٹھیں تو مردوں کو مات دیں جو قابلیت دکھائیں ان کو سلطنت چلائیں"۔[۴۲]

نذیر احمد دہلوی اور علامہ راشد الخیری کے یہاں عورت اور لڑکیوں کے لیے جدید تعلیم کا تصور نہیں ملتا۔ ان کے ناولوں کو پڑھا یا جائے تو "مراۃ العروس" ہو یا راشد الخیری کا "صبح زندگی" یا "شام زندگی" کہیں بھی عورت کا جدید ترقی میں حصہ نہیں ملتا۔ ان کے ہاں عورت گھر سے باہر نکل کر سماج کی ترقی اور بھلائی میں حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں تھا۔ نذیر احمد اور راشد الخیری کا اس سلسلے میں بنیادی خیال یہ تھا کہ مغربی تعلیم و تہذیب مشرق کے لیے زہر کی مانند ہے۔ لہذا ان کے ہاں نسوانی کردار شمع انجمن کی بجائے چراغ خانہ نظر آتی ہیں۔ وہ دینی تعلیم گھریلو کام کاج اور سلیقے و ہنر مندی کو ایک عورت کے لیے کافی گردانتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس خواتین مصنفین کے ہاں عورت کے لیے ان تمام خصائص کے ساتھ ساتھ تعلیم اور خاص کر جدید تعلیم سے بہرہ وراشد ضروری ہے۔ ان کے نزدیک عورت کے لیے ظلم برداشت کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے لیے راہ نجات حاصل کرنے کا سوچے وہ اپنے حالات بہترین بنانے کے لیے گھر سے باہر بھی نکل سکتی ہے اور معاشرے میں اپنے مقام کے لیے جدوجہد بھی کر سکتی ہے ان ہی خواتین میں سے ایک نذر سجاد حیدر ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔ آج سے نصف صدی قبل نذر سجاد حیدر جس ہندوستانی معاشرے کا حصہ تھی اس میں ان کو جدت پسند عورت سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں ان اولین خواتین رہنماوں میں سے تھیں جنہوں نے لاتعداد بے زبان عورتوں کی

حمایت میں آواز اُٹھائی اور انہیں مردوں کے پنجہ استبداد رہا کرانے کی جدوجہد کی۔ ان کے متعدد افسانے اور ناول اسی جدوجہد کی غمازی کرتے ہیں۔[۴۳] نذر سجاد حیدر کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب عورت کا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا عار سمجھا جاتا تھا۔

اس زمانے کی عورت سوچ رکھنے کے باوجود مردوں کے ہم پلہ نہیں قرار دی گئی۔ عورتوں کو ان جائز حقوق سے محروم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی عورت اپنے مرتبے سے نابلد رہی اور محروم بھی۔ تشنگی و نارسائی عورت کا مقدر بنا دی گئی۔ عدم مساوات اور معاشرے میں عورت سے ناروا سلوک ڈھکی چھپی حقیقت نہ رہی۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں۔

> " بین الاقوامی سطح پر تحریک حقوق نسواں ایک معاشرتی نظریہ ہی نہیں سیاسی تحریک بھی ہے جو عورت کے سماجی رتبے اور کردار کے تعین اور معاشرے میں اس کے تشخص کے اظہار کو اپنی منزل مقصود قرار دیتی ہے۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ صنف کی بنیاد پر عدم مساوات کے مظاہر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے جو کم و بیش تمام معاشروں میں کہیں تہذیب و تمدن کے نام پر تو کہیں مذہب کی آڑ میں مستقل جاری و ساری ہے۔[۴۴]

انسانی حقوق کی تحریک نے خواتین کے جذبہ خود آگہی کو جنجھوڑ کر بیدار رہی نہیں کیا بلکہ ان کی گم گشتہ خواہش، اظہار اور تخلیق کو بھی تحریک دی۔ خواتین زندگی کے ہر عہد میں مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہوئیں لیکن حیران کن امر یہ ہے کہ خواتین کے کہیں بھی اپنے حقوق کو پورا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہر سال قوانین بنائے جاتے ہیں لیکن صرف کاغذی کاروائی تک محدود ان قوانین پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔

معاشرے میں انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق کی تحریکوں کے باوجود آج بھی ونی، سوارہ، اور غیرت کے نام پر قتل ہونے والی خواتین کی تعداد میں کمی نہیں ہو سکی ہے۔ آئے روز نت نئے واقعات اخبارات اور میڈیا کی زبانی ہم تک پہنچتے ہیں تو روح کانپ اُٹھتی ہے۔ عورتوں کی سر عام آبروریزی، معصوم بچیوں کے ساتھ جنسی زیادتی کو ایک کھیل سمجھ لیا گیا ہے۔ دفتروں میں ملازمت کرنے والی خواتین کو ہر آساں کرنا معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ دوسری طرف گھریلو خواتین بھی نام نہاد آزادی کے سوا کچھ بھی نہیں حاصل کر سکی ہیں۔ آج بھی عورتیں مردوں کی مرضی کے مطابق اولاد پیدا کرتی ہیں اور لڑکی کو پیدا ہونے سے پہلے ہی ضائع کر دیا جاتا ہے۔ خواتین کو خاندانوں میں بیاہ کر رکھا جاتا ہے یا پھر انہیں تمام عمر کنوارہ رہنے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ مرد کو چار چار شادیوں کے بعد بھی پاک صاف اور عورت کو میلی نظروں سے دیکھا جاتا ہے تانیثیت کی تحریک میں معاشرے کے انہیں ناروا رویوں کے خلاف بہت سی آوازیں بلند کی گئیں۔

x. تانیثیتی تنقید بطور ادبی تھیوری

تانیثی ادبی تنقید یا تانیثیت بطوری ادبی تھیوری بھی تانیثیت کے مختلف پہلوں میں سے ایک ہے۔ تنقید بھی ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے ہم اچھے برے، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تانیثیتی تنقید کے ذریعے ہی صحیح تانیثی شعور پہنچتا ہے کہ ادب میں عورت کو کس طرح پیش کیا گیا ہے اور تانثیتی تنقید کے ذریعے ہی ہم کسی متن کو تانیثیت کے حوالے سے جانچ پر کھ سکتے ہیں۔ تانیثی تنقید ہی نے عام عورتوں کو ان کی صلاحیتوں سے باخبر کہا کہ وہ کیا کر سکتی ہیں اور ان میں مردوں جیسی صلاحیتں ہیں۔ وہ کسی طور پر بھی بے بس لاچار اور قابل رحم اور ناقص العقل نہیں ہیں۔

تانیثی تنقید کا زمانہ بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی کا ہے اور اس زمانے میں نسائی نقادوں کی گئی اہم تحریریں سامنے آئیں اور پھر ان میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا گیا۔ ورجینا ولف کی کتاب (A room of one's oun) سائمن دی بوائر کی (The sexon sex) کیٹ ملٹ کی (Sexual Politics) تانیثیت کے حوالے سے بے حد اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔

تانیثی تنقید کے مختلف اصول ہیں جن کے تحت ادب کو پر کھا جاتا ہے شخص الرحمان فاروقی نے تانیثی تنقید کے مندرجہ ذیل رہنما اصول بنائے ہیں۔[۴۵]

تانیثی تنقید کے مختلف پہلو اور عقلی دلائل ہیں اس کی کوئی مخصوص حدود نہیں ہیں۔ عورتوں کا کردار بطور قاری کے بطور لکھاری کہ تانیثی تنقید تھیوری کا اہم نقطہ ہے۔ تانیثی تنقید کے کئی مدراج ہیں سب سے زیادہ اہم درجہ تو یہ ہے کہ عورتوں کے بنائے ہوئے متون کا مطالعہ، اس طرح کیا جائے کہ ان کو وہ اہمیت مل سکے جس کے وہ مستحق ہے اور جو انہیں اب تک نہیں مل سکی تھی۔ ایک صورت یہ ہے کہ اگر کسی نسبت گم نام عورت مصنف کا مطالعہ کر کے بتایا جائے کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور اسے وہ شہرت نہ دی گئی جس کہ وہ مستحق بھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عورت تھی۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ گمنام یا مشہور، اہم یا غیر اہم، بہتر ہو کہ گمنام اور غیر اہم عورتوں کی غیر مطبوعہ نجی تحریریوں میں روزنامچہ خطوط، یاداشتیں دریافت کر کے شائع کی جائیں اور ان کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے کہ ان کے ذریعے اس زمانے کے حالات خاص کر عورتوں کے حالات، عورتوں کے معاملات کے بارے میں لوگوں کا رویہ وغیرہ دریافت ہو سکے۔

تانیثی تنقید کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ مردوں کے بنائے ہوئے متون کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کہا جائے کہ ان میں عورتوں کے بارے میں کیا تصورات اور اصل شعوری طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ یعنی عورتوں کے بارے

میں قوانین، پابندیاں، تصورات، مفروضات، تعصبات وغیرہ جو معاشرے میں رائج میں اور مردوں کے بنائے ہوئے متون میں کسی حد تک رائج ہیں اور کسی نقطہ نظر سے پیش کیے گئے ہیں یا پھر ان متوں کے ذریعے پتہ لگایا جائے کہ معاشرے میں عورتوں کے بارے میں کس طرح کی باتیں، تعصبات، مفروضات اور قوانین رائج ہیں۔

تانیثی تنقید کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ عورتوں کے بنائے ہوئے متون کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کہا جائے کہ ان میں عورتوں کے بارے میں کسی قسم کے تصورات، مفروضات اور نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ آیا کہ اپنے بارے میں عورتوں کا تصورات، مفروضات اور تعصبات وہی ہیں جو کہ مردوں کے ہیں یا پھر اپنے بارے میں عورتیں کچھ دوسرے ہی تصورات اور مفروضات رکھتی ہیں۔

تانیثی تنقید کا ایک اور پہلو بھی ہو سکتا ہے کہ اس بات کا مطالعہ کیا جائے کہ عورتوں کے یہاں مردوں کے بارے میں کیا اور کس طرح کے تصورات، مفروضات اور تعصبات رائج ہیں۔ اور جہاں جہاں تک وہ اہم آہنگ نہیں ہیں وہاں ان کی تہہ میں کیا اصول، کیا نظریہ کار فرما ہے۔ یہاں یہ بات بھی دیکھی جائے گی کہ عورتوں میں مردوں کے بارے میں کوئی ایسے تعصبات، تصورات رائج ہیں جن کا مقابل یا متبادل مردوں کے یہاں نہیں ہیں یعنی یہ پتہ لگایا جائے کہ آیا مردوں کے بارے میں عورتوں نے کون سی ایسی باتین کہی ہیں جو مردوں نے اپنے بارے میں نہیں کہیں اور نہ عورتوں کے بارے میں اسٹیریو ٹائپ (ایک ہی طرح کے کردار) معاشرے میں یا مردوں کے متون یا پھر اکثر عورتوں کے متون میں بھی پائے جاتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے مثلاً عورت ممتا کی دیوی ہے لیکن سوتیلی ماں بے حد ظالم ہوتی ہے۔ عورت نرم و نازک تو ہوتی ہے لیکن شوہر کی خدمت اور گھر کے کام کاج کے لیے اس سے زیادہ جفاکش اور محنتی کوئی ہستی نہیں۔ مرد کا کام کمانا ہے اور عورت کا کام اُڑانا لیکن اگر مرد نکھٹو ہے تو عورت کا فرض ہے کہ نکھٹو مرد کو کھلائے، پلائے، پالے پوسے کیوں کہ عورت ماں اور دیوی بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔

xi. نسائی رد تشکیل کا تعارف و اہمیت

پوسٹ فیمنزم کو فیمنزم میں تضادات اور غیر موجودات کے خلاف رد عمل کے طو پر دیکھا جاتا ہے۔ خاص طور پر فیمنزم اور تھرڈ ویو فیمنزم میں۔ پوسٹ فیمنزم کو بعض اوقات فیمنزم کے آنے والی اقسام میں سے ایک کے طور پر دیکھا جاتا ہے جیسا کہ فورتھ ویو فیمیزم اور ویمن آف کلر فیمنزم۔

پوسٹ فیمنزم کے نظریہ کو موجودہ اور پچھلے زمانہ کے فیمنزم کے ساتھ اختلاف کی شکل میں پہچانا جاتا ہے۔ پوسٹ فیمنزم جنس سے متعلق احوال سے ترقی کے اگلے درجہ کے لیے جدوجہد میں کوشاں ہے اور اس لیے

اسے ایک ایسے معاشرہ کے حق میں تصور کیا جاتا ہے جس میں جنس / جینڈر تفریق نہ ہو۔ ایک پوسٹ فمینسٹ وہ شخص ہوتا ہے جو کہ ان مختلف نظریات پر یقین رکھتا ہے۔ ان کی ترویج کرتا ہے اور اس پر نافذ العمل ہونے کی کوشش کرتا ہے جو کہ ۷۰ کی دہائی کے فیمنزم سے نکلے ہوں چاہیے وہ روایتی فیمنزم کے حق میں ہوں یا بر خلاف ہوں۔

پوسٹ فیمنزم، فیمنزم یا پولر کلچر اور فیمنسٹ کے آپس کے بدلتے ہوئے تعلقات کو سمجھنے کا ایک طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ پوسٹ فیمنزم، سیکنڈ ویو فیمنزم اور تھرڈ ویو فیمنزم پر بھی تنقید کرتا ہے اور وہ اسطرح کہ وہ فیمنزم کی دوہری نوعیت کی سوچ کے تصور ان کی جنس کے بارے میں اور فیمنسٹ اور فیمنزم کے مابین تعلق کے تصور پر سوال اُٹھاتا ہے۔ یہ اس تصور یا خیال کو پیچیدہ کرتا ہے یا اس کو مکمل طور پر رد کرتا ہے کہ مکمل جنس مساوات بہت ضروری ہے یا قابل تمنا ہے یا یہ حقیقت میں ممکن ہے۔ سیکنڈ ویو فیمینزم پر یہ تنقید ہوتی ہے کہ یہ انتہائی سفید فام، انتہائی تلخ اور انتہائی آزاد خیال ہے لہذا یہ ان عورتون کی نمائندگی نہیں کرتا جو پسے ہوئے طبقات اور تہذیبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

پوسٹ فیمنزم پہلے ۸۰ کی دہائی میں سیکنڈ ویو فیمنزم کے خلاف رد عمل کے طور پر استعمال ہوا جبکہ اب یہ بہت سارے ان نظریات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کہ فیمنزم اور اسکی پچھلی اقسام پر تنقیدی نکتہ نظر رکھتے ہیں اس سے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ فیمنزم آجکل کے معاشرہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پوسٹ فیمنزم ایک ایسی معاشرتی تصور کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ فیمنزم کی تمام پیشتر مقاصد حاصل ہو چکے ہیں لہذا اب اس تحریک پر اصرار کرنا اور اس کی مزید تشریحات کرنا بیکار ہے۔ بہت ساری فیمنسٹ جو کہ پوسٹ فمینز کی نافذ ہیں ان کے نزدیک پوسٹ فمینزم ان سرگرمیوں اور خیالات کا امتزاج ہے جو کہ فیمنسٹ کے نزدیک ظالمانہ اور سیکسٹ (sexist) ہیں۔ پوسٹ فیمنزم کے وسیع تر استعمال اور اسکی غیر واضح تعریف نے دانشورں کو اس بات کے لیے ترغیب دی کہ وہ اس کی نتائج کا مطالعہ کریں۔ جوڈٹ بٹلر یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے کے مطابق کبھی کبھار پوسٹ فیمنزم کو فیمنزم کے خلاف رد عمل کے طور پر جانا جاتا ہے جبکہ کبھی کبھار اس کو نوجوان خواتین کی جانب سے فیمنسٹ نظریہ اور تحریک میں شمولیت کے بالکل نئے انداز کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اپنے ۲۰۰۷ء کے مضمون "پوسٹ فیمنسٹ میڈیا کلچر ایلیمنٹس آف سیوبیلٹی" (Postfeminist media culture: elements of sevibility) میں روزلینڈ گل (Roseland gill) لکھتی ہیں کہ پوسٹ فیمینزم ایک نافذ تحریک سے زیادہ زوحس (ادراک) اور معاشرتی ہے۔[۴۶] گل مزید

کہتی ہیں کہ پوسٹ فیمنزم کو الزام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ان دانشوروں کے لیے جن کے کام کو مبینہ طور پر فیمنسٹ نہ سمجھا جائے۔ مثال کے طور پر جب فیمنسٹ فلاسفر جو ڈٹ بٹلر کا مضمون ۱۹۹۰ء جینڈ ر ٹربل(Gender Trooble) شائع ہوا اور ۱۹۹۴ء کے انٹرویو میں انھوں نے کہا کہا نہیں تضحیک آمیز انداز سے پوسٹ فیمنسٹ پکارا گیا۔

اہلیان۔ جے۔ ہال اور قرنی سلوپو روڈ گزانی ۲۰۰۰ کے آرٹیکل دامیتھ آف پوسٹ فیمنزم میں لکھتے ہیں کہ ''پوسٹ فیمنزم کی چار بنیادیں ہیں۔ پہلا کہ فیمنزم کے لیے خواتین کی حمایت ۱۹۸۰اور ۱۹۹۰میں کم ہوئی۔ دوسرا یہ جس وقت یہ حمایت کم ہو رہی تھی اس وقت نوجوان خواتین میں ایک سوچ جو کہ اینٹی فیمنسٹ تھی پروان چڑھ رہی تھی۔ تیسرا یہ کہ نوجوان خواتین کے خیال میں فیمنزم نے اپنے بڑے اور بنیادی مقاصد حاصل کے لیے ہیں جیسا کہ ووٹ کا حق، افزائش کا حق یعنی افزائش کے انتخاب کا حق اور نمایاں عہدوں پر خواتین کی اضافی نمائندگی وغیرہ'' (۴۷) چوتھا یہ خواتین فیمنسٹ مقاصد کا حصول تو چاہتی ہیں لیکن فیمنسٹ کا لیبل لگانا نہیں چاہتی۔ غرض ایسا نہیں ہے کہ خواتین فیمنزم کی حمایت نہیں کرتیں لیکن وہ فیمنزم کے ساتھ جڑے ہوئے تعبیرات کی حمایت نہیں کرتی دوسرے الفاظ میں وہ نہیں چاہتی۔

ہم ہال اور روڈر گز کی اس لسٹ میں پانچواں عنصر بھی شامل کر لیتے ہیں۔ کچھ نوجوان خواتین کی رائے میں فیمنزم چونکہ انسان مساوات کی بجائے نسوانی مساوات پر توجہ دیتا ہے لہذا یہ فطرتاً مخرجی نوعیت کا ہے۔ لہذا اسکی نوعیت اخراجی (یعنی اس میں بہت سادہ) چیزیں شامل نہیں ہے۔ اس لیے اب کی بار انسانیت کے لیے کون سی قسم موزوں رہے گی بجائے فیمنزم کے دوبارہ ابھرنے کے۔ اس نظریہ پر یقین کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ فیمنزم دراصل مردوں سے عداوت اور ان سے بیزاری کا دوسرا نام ہے اور ایسے لوگ اس موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ خواتین مردوں کے بارے میں سیکسٹ(Sexist) خیالات کا اظہار کریں اور ان فیمنسٹ خواتین کو سیکسٹ ثابت کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ فیمنسٹ پر یہ الزام لگتا ہے کہ وہ مردوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی رائے کہ فیمنزم ردِ ظلم، ردِ سکسزم اور ردِ غالبہ مرد ہونے کیساتھ ردِ مرد بھی ہے۔

غرض یہ بات یاد رکھی جایئے کہ پوسٹ فیمنزم قابل وضاحت ہے یا مکمل طور پر واضح نہیں اور اس نقطہ / نظریہ کو الزام دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پوسٹ فیمنزم کو فیمنزم میں تضادات کی وجہ سے بڑھاوا ملا۔ پوسٹ فیمنزم کو فیمنزم اور رد فیمنزم (اینٹی فیمنزم) میں درمیانی راستہ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو کہ جنسی مساوات اور خواتین کو طاقتور بااختیار بنانے کی بات کرتا ہے لیکن پدرشاہی روایات اور اداروں پر شدید قسم کی فیمنسٹ تنقید کی نفی کرتی ہے۔

وکی پیڈیا کے مطابق پوسٹ فیمنزم ۸۰کی دہائی کے آغاز میں شروع ہوا گرچہ ہاکنسورتھ (Hawkenswooth) کے مطابق اسکی بنیاد ۷۰ کی دہائی میں پڑ چکی تھی جب صحافیوں اور دانشوروں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ فیمنزم ختم (مر چکی) ہے۔ اس تحریک کے پیچھے جو بنیادی نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ فیمنزم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے اور اب وقت آچکا ہے کہ اس سے دوری اختیار کی جائے۔ اس تحریک کا مفہوم زیادہ پیچیدہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مختلف لوگوں کی نظر میں اسکا مفہوم مختلف ہے۔ اور یہاں تک کہ جانے مانے پوسٹ فیمینسٹ بھی اس الجھن تنازع کا شکار ہیں کہ پوسٹ فیمنزم کا چاہے جو بھی مفہوم لیا جائے ایک بات واضح ہے کہ اس تحریک کی ابتداء فیمنزم کے خلاف رد عمل سے ہوئی۔ اس رد عمل کی وجہ وہ درجہ بندی اور گروہ بندی ہے جس نے فیمنزم کو توڑ دیا اور بہت سارے پوسٹ فیمنسٹ کی رائے میں یہ فیمنزم کے زوال کی بنیادی وجہ بنی چاہیے اس رد عمل کو کوئی بھی نام دیا جائے اس میں ایک چیز ضرور موجود ہوتی ہے اور وہ یہ کہ پوسٹ فیمنزم ایک ایسی دنیا کی طرف دلالت کرتی ہے جس میں فیمنزم زوال کا شکار ہے۔

پوسٹ فیمنزم معنی کے اعتبار سے فیمنزم کے اختتام سمجھا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا طرز معاشرت ہے جو فیمنزم کے کچھ حصوں کو قبول، کچھ کو رد اور کچھ کی وضاحت کرتا ہے۔

xii. مزاحمتی رویہ: ادبی تناظر اور اُردو ادب میں مزاحمتی رویہ

ادب کے مزاحمتی حیثیت کو سمجھنے کے لیے لفظ مزاحمت پر غور ضروری ہے مزاحمت کسی نظریے فکر یا نظام کو قبول کرنے سے انکار پر مبنی فلسفہ ہے جب کسی چیز کا انکار اور اس کے خلاف مزاحمت کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انکار کرنے والی حیثیت محکوم، ماتحت اور مجبور کی ہے اور جس کے خلاف مزاحمت کی جارہی ہے وہ ایک طاقت ور عنصر کے طور پر مزاحمت کرنے والے پہ مسلط ہے۔ جب ہم مزاحمتی ادب کی بات کرتے ہیں تو ادب کی اس تخلیقی رویے سے مراد ہوتی ہے جو فکر نظام یا نظریے کو قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ مزاحمت کی اصطلاح مغرب سے درآمد شدہ ہے اور Resistance کا ترجمہ ہے۔

ڈکشنری انسائیکلوبرٹانیکا سے معلوم ہوتا ہے کہ Resistance یا مزاحمت کا لفظ اس وقت منظر عام پر آیا۔ جب جنگ عظیم دوم میں یورپ کے بہت بڑے حصے پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ مقبوضہ علاقوں میں رہنے والوں نے خفیہ طور پر غاصب جرمن فوجیوں کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ اس عمل کو مزاحمت قرار دیا گیا اور ان لوگوں کی تحریک کو مزاحمتی تحریک کا نام دیا گیا۔ یوں یہ اصطلاح منظر عام پر آگئی مگر آج اس اصطلاح کا وہ مفہوم محض وہ نہیں ہے جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا یا آکسفورڈ ڈکشنری میں ہے بلکہ وہ مفہوم ہے جو concise اکسفورڈ میں موجود ہے۔ کسی چیز کو بچانے کے لیے عمل کرنا یا دلائل پیش کرتا ہے۔

کیا ادب اپنی نہاد میں صرف "مزاحمتی ہوتا ہے؟ ادب کے تخلیقی رویے بنیادی طور پر دو مخالف رویوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ مزاحمتی اور مفاہمتی ادب معاشرے میں رائج ان فکری و جمالیاتی رویوں سے مفاہمت کے لیے بھی کردار ادا کرتا ہے جیسے تخلیقی رویے ساز گار قرار دیتے ہیں۔ گویا ادب صرف مزاحمتی نہیں ہوتا مفاہمتی بھی ہوتا ہے۔

مفاہمتی ادب ان فکری اور جمالیاتی اقدار سے مفاہمت سکھاتا ہے یا ان کا مقدمہ پیش کرتا ہے جو معاشرے والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں مفاہمتی تخلیقی رویے ایسے ادب کے ذریعے ان اقدار کو قبول عام بناتے ہیں جن کے لیے معاشرے میں پہلے سے مفاہمتی تصورات موجود ہوتے ہیں۔

مزاحمتی ادب کی بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں۔ جیسے کسی ادیب کا ایسے آورشوں، خوابوں یا آئیڈیل کی تکمیل کی راہ میں روکاوٹ محسوس کرنا کلام فیض احمد فیض جس کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کسی شاعر، کہانی کار کی مثالیت معاشرے کی بھی مثالیت ہو۔ بعض اوقات تخلیق کار اپنی تحریروں میں کسی آئیڈیل کو پیش کرتا ہے مگر معاشرہ اس کی آئیڈیل کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ یوں اس تخلیق کار کی تحریروں میں مزاحمتی رویے جنم لیتے ہیں۔ مزاحمت طے شدہ رویوں، رسم و رواج اور رائج اقدار کے خلاف بھی ہوتی ہے تخلیق کار معاشرے کی از سر نو تشکیل کرتا ہے۔ فرسودہ روایات اور بانجھ فکری تحریکوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ عموماً ایسا مزاحمتی ادب اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے فلسفیانہ دلائل کی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ سماج کی نئی فکری تشکیل کرتا ہے مزاحمتی ادب کا ایک اور رویہ سیاسی، تاریخی اور اقداری بیانیوں سے انکار کرنا بھی ہے عموماً ایسے بیانیے جو کسی حد تک سٹیریو ٹائپ تصورات بن چکے ہوں تخلیق کار انہیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے ایک شاعر یہ کہانی کار جو بیانیہ تشکیل دیتا ہے اسے ریاست یا نظام کا متبادل بیانیہ بھی کہا جاتا سکتا ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے فکری سطح پر ان بیانیوں کو رد کیا جو سیاسی، سماجی سطح پہ حقیقت بنا کے پیش کیے گئے یا ایسے بیانیے جو مقبول عام بیانیے تھے ادیبوں نے ان تمام فکروں، نظریات اور نظاموں کے خلاف مزاحمت پیش کی ہے جیسے خفیہ طاقتوں نے پس پردہ رہ کر مقبول عام بنایا۔ منٹو کی مثال لیجیے۔ ایسے ادیبوں کی تحریروں میں تاریخ کا وہ رخ دیکھا جا سکتا ہے جو واقعاتی تاریخ سے حد درجہ مختلف بلکہ تاریخ کا کو تہہ وبالا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مزاحمتی ادب کی ایک قسم مارشل لائی جبر کے خلاف لڑنا ہے اسے مزاحمتی ادب کے سب سے واشگاف اور بلند آواز بھی کہا جا سکتا ہے۔ عموماً ایسا ادب اکہرا اور تادیر نہیں ہوتا۔ سطحی ادب میں براہ راست مکالمہ ہونے کی

وجہ سے اس کا قاری عام ہوتے ہیں۔ اُردو میں مارشل لاؤں کے خلاف لکھے جانے والے ادب کی بڑی تعداد سطحی ہے۔ حبیب جالب کا شعری سرمایہ جس کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے البتہ فراز، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا وغیرہ نے بھی بہت اہم تحریریں لکھیں جو براہ راست کی بجائے گہرا ادب ہے اس کی ایک بڑی وجہ علامتی انداز ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب مارشل لاؤں کے خلاف لکھے جانے والا ادیب واضح طور پر اپنے موقف کا اظہار کرتا۔ اس وقت یہ تفریق واضح تھی کہ ظالم کون اور مظلوم کون ہے۔ جابر کہاں ہے اور مجبور کیسے کہتے ہیں۔ اقتدار پر قابض ہونے والے حکمرانوں کو ادیبوں کی بڑی تعداد نے قبول نہیں کیا۔ مارشل لاء کے خلاف لکھنے والا ادیب حق کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے۔

آج بھی ایسے ادیب جنھوں نے ضیائی مارشل لا کی حمایت کی یا پس منظر میں افغان جہادی بیانیے کو قبول عام بنایا۔ انہیں ظالم اور غاصب کا ساتھ دینے والا قرار دیا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۵۸۹

۲۔ دی اکسفورڈ ڈکشنری، ۱۹۹۵ء، ص ۴۹۵

۳۔ ہارون انیس، فیمنزم اور پاکستانی عورت مشمولہ فیمنزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲

۴۔ ایضاً، ص، ۱۳

۵۔ کشور ناہید، ادب اور نسائیت، مشمولہ خاموشی کی آواز مرتبہ فاطمہ حسن، آصف فرخی، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۵

۶۔ زاہد حنا، عورت زندگی کا زندان، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷

۷۔ ہزراوں برس قدیم (سرمیری) کتبوں میں جنوبی عرابی کا نام سومیر (Sumer) آیا ہے۔ موجودہ دور میں یہ نام بھی سومیری مذکورہ قدیم کتبوں سے ہی لیا گیا ہے (تفصیل کے لیے ابن حنیف کی کتاب دنیا کا قدیم ترین ادب جلد اول)

۸۔ ابن حنیف، دنیا کا قدیم ترین ادب، بیکن پبلی کیشنز، ملتان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۳

۹۔ ایضاً، ص ۶۸۸

۱۰۔ زاہد حنا، ص ۲۴

۱۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۸

۱۲۔ جاوید اقبال، آزادی نسواں زوال نسواں، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴

۱۳۔ سید ابو اعلی مودودی، پردہ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۱۴۔ پی براوان، The body and society، کولمبیا یونیورسٹی پریس، کولمبیا، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴

۱۵۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان ۲۰۰۵ء، ص ۳۰

۱۶۔ مبارک علی، ص ۲۹

۱۷۔ سید ابو علی مودودی، ص ۲۰

۱۸۔ Encyclopedia of India culture by R.N saletore, vol: 4 Sterling Publishers, New Dehli, Page 731

۱۹۔ عقلیہ جاوید، ص ۳۴
۲۰۔ علی احمد فاطمی، تحریک نسواں اور اُردوادب ،مشمولہ اُردو ادب کو خواتین کی دین، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۵
۲۱۔ سورۃ التکویر، آیت ۸۔۹
۲۲۔ سورۃ النساء، آیت ۷
۲۳۔ www.britannica.com/history of feminism retrieved on 23/2/2018
۲۴۔ ایضاً، ص ۲۴
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۵
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۶
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۸
۲۸۔ والٹرز مارگریٹ، A very short introduction of feminism, Oxford University Press Pakistan, 2007, Page 28-29
۲۹۔ ایضاً، ص ۷۱
۳۰۔ ایضاً، ص ۴۷
۳۱۔ ایضاً، ص ۸۵
۳۲۔ عظمیٰ فرمان، نسائی تنقید مسائل و مباحث، مشمولہ تحقیق ش ۱۸، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱۵
۳۳۔ شمیم نکہت، تحریک آزادی نسواں، مشمولہ اُردو ادب کو خواتین کی دین، اُردو کادمی، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۵
۳۴۔ عظم الشان صدیقی، اُردو ناول کے فروغ میں خواتین کا حصہ، مشمولہ اُردو ادب کو خواتین کی دین، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱
۳۵۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ترقی اُردو بیور، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۴۰
۳۶۔ رشیدۃ النساء، اصلاح انساء، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۲
۳۷۔ نسیم آراء، اُردو صحافت کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۷۷
۳۸۔ زاہدہ حنا، نسائی ادب، ایک سرسری جائزہ، ادبیات، ش ۷۵۱، (جنوری تا جون ۲۰۰۷ء) پاکستانی قلم خصوصی شمارہ، ص ۳۶۸

۳۹۔ علی احمد فاطمی، تحریک نسواں اور اُردو ادب کو خواتین کی دین، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۰
۴۰۔ سید عبداللہ، سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ایجوکیشن ہاوس، دہلی ۲۰۰۶ء، ص ۳۵
۴۱۔ رابعہ اقبال، اُردو ادب اور طبقہ نسواں، ادارہ اُردو، حیدر آباد، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲
۴۲۔ ثاقب رزمی، آزادی نسواں اپنا سویرا ں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۹
۴۳۔ سید جاوید اختر، اردو کی ناول نگار خواتین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۷
۴۴۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۴۹
۴۵۔ شمس الرحمن فاروقی، تانیثیت کی تفہیم، ادبیات خصوصی شمارہ (س۔ن) ۱۷ تا ۲۰
۴۶۔ En.m.wikipedia.com/postfeminism on 7-8-2018
۴۷۔ ایضاً

باب دوم:

اداس نسلیں میں نسائی کرداروں کا مزاحمتی رویہ (نسائی رد تشکیل کے تناظر میں)

الف: "اداس نسلیں" ایک مطالعہ

عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" اردو ناولوں میں اپنی طرز کا منفرد اور شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۳ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس ناول کا ترجمہ عبداللہ حسین نے "The Weary Generation" کے نام سے خود ۲۰۰۰ء میں کیا۔

ناول میں ایک گاؤں روشن پور دکھایا گیا ہے یہ گاؤں پنجاب اور دہلی کے سرحد پر واقع ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نواب روشن علی خان ضلع رہتک کے کلکٹر کے دفتر میں ایک معمولی اہلکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اس نے ایک انگریز کی جان بچائی تھی جس کے بدلے ان کو ۵۰۰ مربع جاگیر عطا کی گئی اور انھیں آغا کا لقب بھی دیا گیا۔ ان کے نام پر اس گاؤں کا نام روشن پور رکھا گیا یوں روشن آغا اور روشن محل کی روایت کا آغاز ہوا۔

روشن آغا کے دوست مرزا محمد بیگ کو ملازمت چھڑا کر اپنے ساتھ لے آئے اور پچاس مربع زمین اور ایک پکا مکان بنوا کر دیا جس کی وجہ لوگوں کے مطابق یہ تھی کہ روشن آغا کے اپنے دوست کی بیوی سے ناجائز تعلقات تھے۔ روشن آغا نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونی ملک بھیجا جس نے واپسی پر اپنی پسند سے ایک ایسے گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی جس کا گھرانہ آبائی پیشے کی وجہ سے شرفاء میں قطعاً قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا اور ہمیشہ کے لیے دہلی کے روشن محل میں رہنے لگا۔ ایسے میں روشن آغا اپنے دوست کے خاندان کی کفالت کرتے رہے اور لوگوں کے مطابق اپنے بیٹے نیاز بیگ کو پالتے رہے۔ لیکن جب بڑھاپا آیا تو روشن محل چلے گئے تو گاؤں سے مختصر تعلق رہ گیا یہ تعلق اس وقت پھر بڑھا جب نیاز بیگ کے بھائی اور جوان بیٹے نے روشن محل میں نئے روشن آغا کی رسم دستار بندی میں شرکت کی اور اس کی بیٹی عذرا نیاز بیگ کے بیٹے نعیم کو گھائل کر گئی لیکن اس کے ایک فلسفے نے اس کی زندگی کا رخ بدل ڈالا اور وہ اپنے سرپرست غریب تعلیم یافتہ چچا کو چھوڑ کر گاؤں اپنے اجڈ گنوار غریب باپ کے پاس آ گیا۔ جہاں اس نے دیہاتی زندگی میں وقت گزرنے کی پوری کوشش کی لیکن اسے پتہ چلا کہ اس کے باپ کو اسلحہ بنانے کی جرم میں دوبارہ جیل ہوئی اور اس کی جائیداد ضبط ہو چکی ہے اپنی بے بسی پر افسوس کرنے لگا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود میں انگریز سرکار کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ لمحہ فکریہ نعیم

کو تنگ کرنے لگا۔ اس لیے جنگ آزادی کے دوران جب جبری بھرتی ہوئی تو اس نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کر دیں اور جنگ کے خاتمے پر ایک بازو کٹوا کر وکٹوریا کراس اور انعام کی زمین کے ساتھ واپس آیا اور احمد دین کے ساتھ ہونے والی غیر انسانی سلوک سے متاثر ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لیے دہشتگردوں کے ساتھ مل کر انگریز حکام کے خلاف جنگ کرتا رہا وہاں ایک لڑکی کے ساتھ تعلقات کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ وہ اسے قتل کر دیں گے تو وہ وہاں سے بھاگ نکلتا ہے اور گاؤں آکر عذرا کے خاندان کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی کر لیتا ہے۔ نعیم کی بیوی اسے اپنے خاندان کا ہم پلہ بنانے کے لیے سیاست میں اہم کردار ادا کرنے پر مجبور کرنے لگتی ہے۔ اس دوران جلیانوالہ باغ کا سانحہ ہوتا ہے مزاحمتی تحریکیں شروع ہو جاتیں ہیں۔ نعیم اور اس کی بیوی بھی اس میں شریک ہوتی ہیں۔ جات نگر کے جلسے میں تقریر کے بعد نعیم گرفتار ہو کر جیل چلا جاتا ہے اور دونوں اندر سے شکستہ ہو جاتے ہیں - نعیم کے جیل جانے کے بعد اس کا سوتیلا بھائی علی عائشہ کی محبت میں سرشار ہو کر اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنے لگتا ہے جیل سے واپسی پر وہ اپنے بھائی کو بڑی مشکل سے قابو کر کے اپنے آپ کو پوری طرح دیہاتی ماحول میں گم کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی دوران نہ صرف علی کو کارخانے کی ملازمت دلواتا ہے بلکہ دونوں میاں بیوی پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے خود نعیم سیاست میں پہلے کانگریس اور پھر مسلم لیگ میں شمولیت اور جیل کی سختیوں سے فالج کا مریض ہو کر اپنی بیوی اور سسرال کا محتاج ہو جاتا ہے اور تندرست ہونے تک اندر سے مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس پریشانی اور مشکل حالات کے باوجود اپنے سسرال کے تعلقات کو استعمال میں لاتے ہوئے وزارت تعلیم میں سیکرٹری کی ملازمت حاصل کر لیتا ہے اور یوں اپنی زندگی کے سب سے مشکل وقت کو انتہائی ذمہ داری اور خاموشی سے گزار دیتا ہے اسی دوران میں اس کا عذرا سے اختلاف بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ معاملہ علیحدگی اور گھر چھوڑنے تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے آزادی کے قافلے میں شامل ہونے ،ہجرت کے دکھ اٹھانے اور بلوائیوں کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر ختم ہو جاتا ہے جب کہ اس کا بھائی علی اور روشن آغا کا خاندان پاکستان آکر نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

i. اُداس نسلیں میں موضوعاتی تنوع

ناول "اداس نسلیں" اردو کا نہ صرف ایک شاہکار ناول ہے بلکہ موضوعاتی حوالے سے بھی ایک اعلیٰ ناول ہے اس ناول میں بیک وقت کئی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں تاریخ، تہذیب، سیاست، ثقافت، جنگ وجدل، مذہب، جنس، جاگیر درانہ نظام، طبقاتی کشمکش، تقسیم، ہجرت فسادات، نچلے طبقے کے لوگوں کے حالت زار، سماجی شعور، طبقاتی جدوجہد اور سماجی وسیاسی ناہمواریوں کے خلاف عملی بغاوتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

ایک بڑا ناول صرف رومانوی کہانی کی وجہ سے بڑا نہیں ہوتا بلکہ ناول کثیر موضوعات کا مجموعہ ہوتا ہے ایک بڑے جاندار ناول کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ سچائیاں ہوتی ہیں یہ اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ اس لئے اداس نسلیں کی کہانی میں پھیلاؤ ہوتا ہے، اس لیے اتنے سارے موضوعات کو زیر بحث لانا آسان ہوتا ہے۔ اس ناول میں تقریباً سو سال کے حالات کو موضوع بنایا گیا ہے اور ہندوستان کی معاشرتی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں یہ سو سال بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ایک طرف ان سالوں میں دنیا کی سطح پر دو بڑی جنگیں لڑی گئیں جن کی وجہ سے دنیا تصادم کا شکار ہوئی اور طاقت کا توازن خراب ہو کر رہ گیا دوسری طرف انسان نے علمی سطح پر بھی بہت ترقی کی۔

اس پورے معاشرتی تاریخ کے سفر میں دنیا کی سطح پر تین ممالک (جو اس وقت دو تھے) انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش معرض وجود میں آئے اور دنیا سے ہندوستان اور برصغیر جیسے لفظ ختم ہو گئے۔ کیونکہ پاک برصغیر کی وحدت ختم ہو گئی اس عرصے میں برصغیر نے بہت سارے سیاسی و معاشی نشیب و فراز دیکھے۔ برصغیر میں تقسیم کا سلسلہ جاری رہا جو کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک جاری رہا ہے۔

ii. سیاسی نشیب و فراز

"اداس نسلیں" کا دورانیہ تقریباً ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بنتا ہے اور یہ دور سیاسی و سماجی طور پر ہندوستان کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں سیاسی و سماجی طور پر بڑی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ یوں کہنا غلط نہیں ہو گا کہ دنیا بھر میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اس زمانے میں دو عظیم جنگیں لڑی گئیں جس نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی اور انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ دوسرے ممالک کی طرح برصغیر کے لوگ بھی ان حالات و واقعات کا شکار ہوئے اور ان حالات کے سبب معاشرتی تصادم کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا۔

"اداس نسلیں" کا منظر نامہ سیاسی و سماجی حوالے سے بھرپور ہے اس عہد میں ہندوستانی سیاست کے بہت سارے عوامل سامنا کرتے ہیں ۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندوستانی محکومیت ،سیاسی بیداری، کانگریس کی سرگرمیاں، تقسیم بنگال، سیاسی اتحاد، سائمن کمیشن، جلیانوالہ باغ کا واقعہ، پرنس آف ویلز کی آمد، فسادات، تحریک آزادی، اعلیٰ طبقے کا سیاست میں عمل دخل وغیرہ، تقسیم ہند اور اس کے آنے والی نسلوں پر اثرات ایسے بہت سارے واقعات جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں سیاسی منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔

دراصل یہ سب ایسے موضوعات ہیں جو ناول کی نسبت میں موضوعاتی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان واقعات کا کسی نہ کسی طرح تعلق سیاست سے جاملتا ہے تو اس لیے اداس نسلیں اپنے عہد کا سیاسی و سماجی ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے اس ناول کا آغاز ہوتا ہے اور ۱۹۴۷ء کے واقعات پر اسے ختم کر دیا جاتا ہے یعنی اسی کہانی کا آغاز بھی ایک سیاسی واقع سے ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ بھی ایک سیاسی واقعہ پر ہوتا ہے۔ اس کہانی میں تین نسلوں کی داستان کو پیش کیا گیا ہے اور نسلوں کی کہانی میں سیاست کو بڑا عمل دخل ہے۔

"اداس نسلیں" کو تین نسلوں کی روداد کہنا غلط نہیں ہو گا اگر دیکھا جائے تو ان تین نسلوں کی کڑی میں سیاست کا عنصر اہمیت کا حامل ہے۔ اس عنصر کی بدولت نسلوں کی داستان ایک وحدت میں سمو جاتی ہے اس بنا پر اگر اسے تین نسلوں کی سیاسی روداد یا داستان کہہ دیا جائے تو یہ بے جانہ ہو گا کیونکہ کہانی کا عمل جس زمانے کو بیان کرتا ہے اس کی ابتداء اور انتہا بہتر طور طور پر سیاسی واقعات پر مشتمل ہے۔ دراصل قوم یا نسل میں سیاست کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے بلکہ قوموں کی زندگی کا انحصار سیاست پر رہا ہے۔ اس لئے راقم اداس نسلیں کو اپنے دور کا ایک سیاسی و سماجی ناول قرار دینا غلط نہیں ہو گا۔ عبد اللہ حسین نے اپنے عہد کی سیاسی و سماجی ناہمواری اور اس عہد کی اجتماعی تصویر دکھائی ہے دراصل ادیب علامت کنایوں اشاروں میں اپنے عہد کی اجتماعی تصویر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

iii. جنگیں

جنگ انسانوں کی طرح جانوروں کے لئے خطرناک ماحول کو فروغ دیتی ہے اس جنگ نے دنیا کو خطرناک موڑ پر پہنچایا ہے جاندار شے کے لئے جنگ کبھی اچھے اثرات کا سبب نہیں بنی ہے جنگ کی تباہوں کے ذد میں آنے والی قومیں آج بھی اپنا سیاسی و معاشی لیول بہتر نہیں کر سکی۔ قومیں اخلاقی، معاشی و سیاسی اور ذہنی اور روحانی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں یورپ نے دو دفعہ خود کشی کی ہیں دنیا بھر کے لوگوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح یورپ جیسا ترقی یافتہ ملک اجتماعی خوچ کشی کرتا ہے اور اپنے سمیت دوسرے ممالک کے لئے خود کش کا کردار ادا کرتا ہے۔ آج دو جنگوں کے اثرات سے آنے والی نسلیں نہیں بچ سکیں ہیں۔ لہذا جنگیں کبھی اچھا ماحول صاف فضا کو فروغ نہیں دے سکتی ادیب شعراء اپنے سماج میں حساس طبقہ ہونے کی وجہ سے اجتماعی مسائل اور اجتماعی ناہمواریوں کو اپنے قلم سے بیان کرتے ہیں دنیا بھر کے ادیبوں نے جنگوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے اس طرح اُردو ادب میں عبد اللہ حسین نے اداس نسلیں میں جنگوں کے اثرات زدہ عوام کی بہترین عکاسی کی ہیں۔ اداس نسلیں کا ایک کردار نعیم جنگ کا متاثرہ کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نے دکھایا ہے کہ جنگ اپنے ساتھ حلوہ راحت اور آسانیاں نہیں لاتی بلکہ دکھ، درد اور تکالیف لاتی ہیں۔ یہ کسی قوم یا ملک کے لئے تباہی کے علاوہ کچھ نہیں۔

ناول "اداس نسلیں" میں عبد اللہ حسین نے جنگ کا منظر بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا۔ پہلی جنگ عظیم کو اس ناول کے موضوعات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ناول اور اس کے اثرات زیادہ نمایاں کرنے کے لیے بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے

جنگ اوراس زمانے کی بھرپور عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے-ناول نگار نے جنگ سے قبل اور جنگ کے بعد کے حالات واقعات کو بہترین طریقے سے پیش کیا ہے۔ جنگ میں انسانی تباہ کاریوں اور غیر انسانی رویوں کو قاری پر چھوڑا ہے۔

iv. تہذیب وثقافت

ناول "اداس نسلیں" کی کہانی کا تعلق روشن پور سے ہے اس لیے اس میں روشن پور کی ثقافت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں روشن پور کی ثقافت کے عناصر کو پیش کیا گیا ہے۔ لوگوں کے رہن سہن کو موضوع بنایا گیا اور ساتھ ساتھ وہاں کے انسانوں کی زندگی کے جو خدوخال ہیں وہ اُجاگر کیے ہیں اور اس سے ایک ایسے معاشرے کی تصویر سامنے آئی ہے جہاں لوگ اکثر خوشحال نہیں ہوتے۔ توان کا کوئی ایسا خاص غم یا مسئلہ بھی نہیں ہے۔

v. مذہب

انسانی سماج میں مذہب کو انفرادی یا اجتماعی صورت قرار دیا جائے یا نہیں لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مذہب کا سہارا لینا دراصل انسان ہونے کی ایک دلیل ہے۔ دنیا میں ایک سے زیادہ سچائیاں موجود ہیں۔ انسان اپنے معیار اور عقل کی کسوٹی پر دنیا کو پرکھتا ہے۔ انسان سکون حاصل کرنے کے لئے مذہب یا سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف رجوع کرتا ہے انتشار اور خلل سے بچنے کے لئے مذہب سے بڑا سہارا کوئی نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک یا ترقی پذیر ممالک میں مذہب کا کردار رہا ہے قوموں کی اجتماعی زندگی میں مذہب کو نکال دینا یہ ایک بغض تو ہو سکتا ہے لیکن افاقی سچ کو رد کرنا ایک قسم کی ہٹ دھرمی ہے۔ عبد اللہ حسین نے ادب میں فلسفیانہ مباحث کے ساتھ ساتھ مذہب کے بارے میں اُٹھنے والے سوالات کو بھی پیش کیا ہے۔ جب نعیم بیماری کی حالت میں ہوتا ہے تو مذہب کے بارے میں سوال وجواب کرنے لگتا ہے دراصل یہ اشارہ ہے کہ مذہب کی طرف رجوع کرنا دراصل انسان کی فطرت میں شامل ہے انسان مذہب کا انکار کرتا ہے لیکن اس کی حیثیت اور سچائی کو رد نہیں کر سکتا۔ مذہب سماج میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

vi. جاگیر دارانہ نظام کی عکاسی

انسانی سماج کی مثال ایک مشین کی طرح ہوتی ہے اس انسانی سماج میں حرکت پیدا کرنے کے لیے انسانوں کو محنت کرنا پڑتی ہے اس طرح سلسلہ روز و شب کا سفر جاری رہتا ہے لیکن خلق خدا کبھی خالق کی صورت اختیار کرتے ہوئے اپنے علاوہ بے کسوں کو بے دریغ مشینوں کی طرح استعمال کرنے لگتی ہے تو انسانی سماج جو کہ مشین کی مانند ہے تو یہ مشین (انسانی سماج) تضادات کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ جاگیر دار جو کہ ایک منفی سوچ کا نام ہے یہ اپنے آپ کو خدا یا روحانی مخلوق سمجھ کر دوسروں کی محنت اور عزت کا استحصال کرنے لگتا ہے۔ یہ خود ساختہ جاگیر دار مالدار بنتا جاتا ہے اور اس کی نسلیں مالدار سے مالدار تر جبکہ غریب سے غریب تر اور غریب کی اولاد بھی اس طرح سرکل کا حصہ بنتی ہے ناول "اداس نسلیں" کا زیادہ حصہ کسانوں کے مسائل کی نمائندگی کرتا ہے۔ جاگیر دارانہ سوچ کے حامل کرداروں کی نفسیات نعیم اور علی کی صورت میں قاری پر عیاں ہوتی ہیں یہ کہ کس طرح غیر انسانی رویوں کے مالک بنتے جاتے ہیں ان کے سامنے بے بس انسان یا عورت صرف ٹشو پیپر کی مانند ہوتی ہے یہ ایک ایسا زہریلا نظام ہے جو کہ اپنے عہد کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کو معاشی اور عقلی غلام بناتی ہے۔

vii. جنس

جنس انسانی زندگی کی ایک حقیقت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ فرائڈ نے اپنے نظریات کی بنیاد جنس پر رکھ کر دنیا کو چونکا دیا۔ فرائڈ کے نزدیک بھی انسانی شخصیت کی تشکیل میں جنس کی اساسی اہمیت ہے۔ اس لیے اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن ہر چیز کی حد سے زیادتی انسان کو بیمار کر دیتی ہے۔ یہی حال جنس کا بھی ہے۔ صحت مند جنسی زندگی انسان کو بھرپور توانائی فراہم کرتی ہے۔ جبکہ غیر تسلی بخش جنسی زندگی انسان کی بہت ساری صلاحیتوں کو بے کار بنا دیتی ہے اور اس کی زندگی میں بہت سارے مسائل جنس ہی سے سامنے آتے ہیں۔

ناول "اداس نسلیں" میں بھی جنس کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن اس میں زیادہ تر یا تو ناجائز تعلقات کے موضوعات ہیں یا جنس کو ایک ایسا موضوع بنا کر پیش کیا گیا جس سے نظر کو تسکین ملتی ہے۔ شیلا اور نعیم کے جنسی تعلقات ناجائز تعلقات ہیں اور اس طرح نعیم جب جیل سے باہر ہو کر آتا ہے تو اس کی جنسی طاقت ختم ہو چکی ہوتی ہے وہ اپنی بیوی کی تسکین نہیں کر پا رہا تو بیوی کو بھی اس کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی جیل میں اس کی خوراک کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

جنس کا ایک نمونہ

"نعیم نے اسے گردن کے نیچے نرم جگہ پر چوما۔

شیلا" اس نے بھاری آواز سے کہا۔

"آہستہ بولو"

"شیلا" اس نے سرگوشی کی۔ "تمھیں پتہ ہے بوسوں کا مزا کیسا ہوتا ہے؟"

"نہیں"

"مجھے چومو"

شیلا نے آہستہ سے اس کے گال کو چوما۔

"نہیں ہونٹوں پر"

"اوں ہوں"

"کیوں؟"

"یہ مرد کا بوسہ ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔" وہ اس کی بغل میں منہ دے کر بولی۔ "اچھا سنو۔ یہ پانی کی طرح ہوتے ہیں۔ جب پیاس لگی ہو تو پانی میٹھا لگتا ہے۔ جب نہ لگی ہو تو بدمزہ لگتا ہے۔ دراصل اس کا کوئی مزہ نہیں ہوتا۔" وہ اس کی چھاتی میں منہ دے کر ہنسی۔ "تم عجیب باتیں کرتے ہو" وہ خاموشی سے اس کی قمیض الگ کرتا رہا۔" (۱)

ناول کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار جنس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا بلکہ جنس کو خوشگوار احساس کے طور پر دیکھتا ہے۔ جنس جو کہ ہمارے سماج میں ایک متنازعہ صورت اختیار کرتا ہے حالانکہ یہ انسانی جبلت ہے اس کی بھوک ذہنی بھوک اور پیٹ کی بھوک کی طرح ہوتی ہے انسان جذبات و احساسات کا مجموعہ ہے مرد اور عورت کا مجموعہ انسان بنتا ہے تضاد کی صورت کا سامنا ایسے وقت میں ہوتا ہے جب لکھنے والا اس حسین تجربے کو درندگی سے پیش کرتا ہے جنس کو درندگی قرار دینا ایک حیوان قرار دینے والی صورت ہے تانیثیت میں ایک سوال جو اُٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ مرد کی سوچ عورت کے حوالے سے تاریکی کا شکار ہے یہ عورت کو صرف بوسے اور ہم بستری تک رکھتا ہے حالانکہ یہ جنسی خواہش صرف عورت کی طرف سے نہیں اُٹھتی لیکن مرد ذات عورت کو صرف درندے کی نظر سے دیکھتا ہے اس کی عکاسی اس اقتباس میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ عورت کو انسان نہ سمجھنا ایک غیر فطری عمل ہے اس لئے اس غیر انسانی روئے کے خلاف معاشرتی تحریکیں جنم لیتی ہے نعیم کی سوچ کے ذریعے دراصل جاگیر درانہ اور مردانہ سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔

ناول کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول نگار نے عورت کو بطور انسان نہیں بلکہ عیاشی کے سامان کو طور پر پیش کیا ہے۔ ناول نگار کا یہ رویہ ناول میں جابجا ملتا ہے۔

viii. طبقاتی کشمکش

طبقاتی کشمکش زندگی کا اہم المیہ ہے اس المیے کے کردار ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور دنیا میں ہر جگہ ،اعلیٰ، نچلے اور درمیانی طبقے کے لوگ پائے جاتے ہیں اور زندگی کا توازن بھی ان طبقوں کے بیچ توازن قائم رہنے سے قائم ہوتا ہے۔

ناول "اداس نسلیں" میں اگر ایک طرف اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف درمیانہ طبقہ اس ناول میں موجود ہے۔ اعلیٰ طبقہ روشن آغا، درمیانہ طبقہ نیاز بیگ اور نعیم اور نچلا طبقہ شیلا اور اقبال وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ ناول میں مزدوروں اور افسروں کے بیچ طبقاتی کشمکش کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

نعیم ان دونوں طبقوں (اعلیٰ، نچلا) کے درمیان کڑی کا کام کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس کڑی کی مانند ہر وقت کھینچاؤ کا شکار رہتا ہے۔ کیونکہ ان طبقوں کے درمیان ہمیشہ کھینچا تانی رہتی ہے۔ اور اس کا اثر نعیم پر پڑتا ہے کیونکہ وہ اگر کسانوں کے لیے کچھ کرتا ہے تو روشن آغا خفا ہوتا ہے اور اگر روشن آغا کے لیے کچھ کرتا ہے تو پارٹی والے اور نچلے طبقے کی نظر میں گرتا ہے اس سے نعیم کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ناول میں تینوں طبقوں پر بات کی گئی ہے اور ہر طبقے کی ضروریات اور مسائل کا تذکرہ ملتا ہے اس کے ساتھ مرکزی کردار نعیم اور عذرا دونوں اس طبقاتی کشمکش میں پسنے والے کردار ہیں۔ کیونکہ نعیم کا تعلق درمیانی طبقے سے ہے اور عذرا کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہے۔ لیکن نعیم کا رہن سہن نچلے طبقے والوں کے ساتھ ہے اس لیے عذرا کے لیے بھی ان کے ساتھ رہنا مشکل ہوتا ہے اور اکثر وہ دہلی میں رہتی ہے اس طرح اس ناول کے کردار طبقاتی کشمکش میں پسنے والے کردار ہیں۔

ix. تقسیم، ہجرت اور فسادات

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کا معاشرتی منظر نامہ تغیر کا شکار ہوا۔ اس خطے سے وابستہ عوام نے زندگی کے اجتماعی مشکل مراحل دیکھیں۔ یہاں پر طبقاتی کشمکش کا سلسلہ زور پکڑتا رہا۔ یہ سلسلہ روکنے کا نام نہیں لیتا اب تک کسی نہ کسی صورت میں سماج مختلف طبقات میں بٹ گیا۔ قیام پاکستان سے لیکر اب تک پاکستانی معاشرہ مختلف طبقات کا شکار رہا ہے تیسری دنیا کے لوگ پسماندہ ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی محرومیوں کا شکار رہے ہیں۔ وہ لوگ جو ذاتی مقاصد کے حصول، دولت اور عہدوں کے لئے زندگی بسر کر رہے تھے انہوں نے اپنے سے کم تر اور کمزوروں کا استحصال کیا اور اس طرح طبقات کا زور بلند ہوا۔ اس طرح تضادات کا نہ ختم ہونے والا یہ سلسلہ جاری رہا۔ "اداس نسلیں" میں طبقاتی کشمکش کی صورت حالات قاری پر روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے

روشن پور اور نعیم کا گھرانہ اس کے علاوہ کسان مزدور سب دراصل طبقات کی طرف اشارہ ہے ناول کے کردار براہ راست طبقات کی طرف اشارہ ہے عنوان "اداس نسلیں" دراصل بنیادی ضروریات سے محروم عوام کی صدا ہے۔ وہ اداس نسلیں جن کو خصوصی طور پر بنیادی ضروریات زندگی تعلیم، صحت، معیاری خوراک، معیاری لباس سے دور رکھا گیا ہے جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اب تک سہولیات سے دور رکھا جارہا ہے۔ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

تیسری دنیا کے پسماندہ عوام ذہنی طور پر معذور اور بونے ثابت ہوئے ہیں اس کی وضاحت اس طرح ممکن ہے کہ یورپی ممالک کی طرح نڈر اور فاتح سوچ کے ساتھ اپنا ارتقائی سفر جاری نہیں رکھ سکے ہیں۔ برصغیر کے عوام ایک سلسلہ وار غلامی کے شکنجے میں گرفتار رہی ہے اور ابھی تک مختلف قسم کی غلامی در غلامی کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ تقسیم ہند کے اثرات ہجرت اور فسادات کے موضوع پر بہت زیادہ لکھا جا چکا ہے مختلف اصناف میں اجتماعی کرب کو ادیبوں نے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن ناول وہ صنف ادب ہے جس میں اپنے عہد کی اجتماعی تصویر کشی ممکن ہے اس صنف ادب میں مصنف ہر قسم کا موضوع سمو سکتا ہے دنیا بھر کے ادب میں ناول وہ صنف ہے جس میں اپنے عہد کی سیاسی و معاشی منظر نامے کو پیش کیا گیا ہے۔ اُردو ادب میں عبد اللہ حسین اور دیگر ناول نگاروں نے ہجرت، فسادات کے جو موضوعات کو غیر جانبداری سے بیان کیا ہے دکھی انسانیت کو قاری پر عیاں کیا ہے کہ تقسیم، ہجرت اور فسادات میں مسلمان، سکھ، ہندو سے ہٹ کر انسان اور انسانیت کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے ناول "اداس نسلیں" نوحہ ہے ان حالات واقعات کا جس نے تقسیم ہند کے فسادات کو دیکھا اور محسوس کیا ناول میں بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

تقسیم ہجرت اور فسادات دراصل ایک واقعے کے تین رُخ ہیں۔ ناول کا تعلق انسانی زندگی سے ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے تاریخی عوامل سے بھی ہے۔ اس لیے ناول کے موضوعات میں تقسیم، ہجرت اور فسادات بھی شامل ہیں۔

ناول "اداس نسلیں" کا اہم حوالہ بھی فسادات ہیں اس فسادات اور ہجرت کے دوران انسانی زندگی کی پامالی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اور انسان کی اپنی حیثیت سے گر جانے کا تذکرہ بھی ملتا ہے ناول میں پچاس سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا یہ واقعہ برصغیر کی تاریخ کا اہم واقعہ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی سطح پر ہونے والی سب سے بڑی ہجرت کی بھی مثال ہے۔ ہجرت کے دوران لٹنے اور مارنے کا غم ہر وقت رہتا تھا لیکن ایک موقع پر یہ سب چیزیں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں مثلاً:

"اسی روز قافلے پر پہلی بار حملہ ہوا۔ حملہ آور ہندو اور سکھ تھے جو کلہاڑی، بلموں، تلواروں اور رائفلوں سے مسلح تھے قافلے والے بہت سے مردہ اور زخمی چھوڑ کر کر آندھی کی طرح بھاگے۔ اب وہ موت سے واقف ہو چکے تھے۔" (۲)

ناول میں فسادات کے حوالے سے جو تفصیل ملتی ہے۔ وہ اردو کے دوسرے ناولوں میں کم ملتا ہے لیکن اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ عبداللہ حسین فوراً لوٹ مار کے قصے شروع نہیں کرتے بلکہ آہستہ آہستہ ان چیزوں کی طرف آتے ہیں اور بیان کرتے جاتے ہیں۔

ناول میں ہجرت اور فسادات کے تمام حوالے موجود ہیں۔ چاہے وہ جنسی استحصال ہو یا مالی، ذہنی اور جسمانی ہر قسم کے واقعات "اداس نسلیں" میں موجود ہیں۔ اور اس طرح یہ ناول نہ صرف ایک تاریخی دستاویز بن جاتا ہے بلکہ اجتماعی دکھ درد کی فلم قرار دیا جاسکتا ہے۔

x. سماجی شعور کی فرمائی

کہانی کا تعلق انسانی زندگی سے ہوتا ہے اور زندگی کا رشتہ سماج سے ہوتا ہے۔ اس طرح سے کہانی پر بھی سماج کا اثر پڑتا ہے اور اچھا ناول یا کہانی وہ ہوتی جو سماج کی بھرپور عکاسی کرتی ہو۔ سماج میں مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والوں کو اپنے حقوق کا جب اندازہ ہونے لگتا ہے تو قدامت پسند سوچ رکھنے والے اجتماعی سماج شعور کو پروپگنڈے پر روکنا چاہتے ہیں یہی حالات "اداس نسلیں" میں علی کردار کے ذریعے دکھایا ہے کہ پروفیسر تاریخ کا سفر اور اپنا موجودہ حال تاریخ کے تناظر میں بتاتا ہے کہ ہماری موجودہ پوزیشن کیوں ایسی ہے؟ ہم پر کون لوگ مسلط ہے؟ ہمارا کس طرح کون استحصال کر رہا ہے؟ اس طرح سماجی شعور بیدار کرنے کے لئے یہ مکالمہ کرداروں کے ذریعے کرایا ہے تاکہ معاشرتی تاریخ سے سبق حاصل کر کے آنے والی نسل شعور حاصل کر لیں۔ اس بارے میں ایم۔ ڈی۔ تاثیر لکھتے ہیں۔ "ناول وہی بہتر ہے جو سماج کی زندگی کا پورا ترجمان ہو زندگی سے بھی بھرپور ہو۔ (۳)

xi. کسانوں کے حالت زار

ناول "اداس نسلیں" کا تعلق روشن پور کی کہانی سے ہے۔ روشن پور کا علاقہ کسانوں سے بھرا پڑا ہے اور اس علاقے کے کسانوں کی زندگی کا بھرپور نقشہ اس ناول میں موجود ہے۔ کیونکہ ایک طرف اس علاقے میں موجود کسانوں کے لیے فصل کی اہمیت پر بحث کرتا ہے تو دوسری طرف اس گاؤں میں موجود کسان کی فصل کے سود پر تخم لینا جیسے مسائل کا تذکرہ بھی ملتا ہے کسان کی زندگی میں فصل کی کیا اہمیت ہے۔

ناول کے ذریعے کسانوں کے حالت زار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس بات کو لوگوں کے سامنے لایا گیا ہے کہ ملکی معیشت کے یہ معمار کس حال میں رہ کر معیشت کو مستحکم کرنے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔

xii. قید وبند کی زندگی

ناول اداس نسلیں کا زمانہ تاریخی حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اس زمانے میں کانگرس اور دوسری پارٹیاں برسرپیکار تھیں اور اس زمانے میں سیاست کے میدان میں کام کرنے والے ہم ارکان کو جیل کی یاترا بھی کرنی پڑی اور اس طرح نعیم کو بھی جیل بھیجا گیا اور یہاں کے جیلوں کی زندگی کے اہم مرقع پیش کیے گئے۔ جیل کی زندگی کے لیے برسرپیکار رہنے والے قیدی زندگی سے تنگ بھی ہیں اور زندگی کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ جیل میں بھی اس کی زندگی ایک اذیت ہوتی ہے اور جیل کے باہر بھی اس کی زندگی کو خطرہ ہوتا ہے۔ ناول میں نعیم کو جیل بھیجنے کے بعد اس کی وہاں گزرنے والی زندگی دکھائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ وہاں موجود قید کے حالات سے بھی ہم کو خبر کر دیتے ہیں۔

بیسوی صدی کے پہلے عشرے سے برصغیر میں مختلف سیاسی جماعتیں، مزاحمتی تحریکیں سر اُٹھا رہی تھیں۔ اپنے لئے الگ جداگانہ ملک کا تصور اور انگریز سامراج کے خلاف مزاحمت کی مختلف صورتیں ابھر کر سامنے آرہی تھیں ایسے میں انگریز سرکار طاقت کا استعمال کر کے جیل میں سیاسی و معاشرتی جبر کا ماحول برپا کر رہی تھی تو ایسے جس جلیانوالہ باغ کا واقعہ برصغیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے جہاں ہزاروں بے کسوں کو مارا جاتا ہے۔ حقوق کی آواز بلند کرنے والوں کو ہمیشہ کچل کر رکھا گیا ہے۔ اپنے زمینی خداؤں سے حقوق مانگنا موت مانگنے کے برابر ہے اس لئے برصغیر کے عوام کو جنہوں نے انگریز سامراج کے خلاف بغاوتیں کیں تو سامراجی پالیسوں کے مطابق اس کو غدار اور نیچا دکھانے کے لیے پروپگنڈے کا سہارا لیا ہے۔ ناول، "اداس نسلیں" کا کردار تاریخ کا پروفیسر جب ہجرت کرتے ہوئے اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کا حال سناتا ہے تو قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے نو آبادیات اور سامراجی ظلم اب تک جاری ہے۔ برصغیر میں غلامی کے خلاف لوگوں کو اکسانے پر لوگوں کو سرعام سزائیں دی گئی ہیں۔ لیکن ظلم کا نظام کب تک!!! "اداس نسلیں" کا ہر سطر دراصل ظلم و تشدد اور ریاستی جبر کے خلاف ایک آہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ معاشرتی زوال میں سامراج کی پالیسیوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

xiii. اُداس نسلیں کے رومانوی حوالے

اُداس نسلیں ایک تاریخی ناول ہے اور تاریخی واقعات پڑھتے وقت دلچسپی کا سامان پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔اُداس نسلیں میں بیک وقت چار کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔جن میں نعیم اور عذرا،شیلا اور نعیم،خاور اور نجمی، عائشہ اور علی کی کہانیاں اہم ہیں۔

نعیم اور عذرا اس ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ان دونوں کے درمیان محبت کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ان کی محبت میں اُتار چڑھاؤ کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ شیلا اور نعیم کی محبت کو دکھایا گیا ہے۔نعیم شیلا کو دھوکا دینے کے بعد فرار ہو جاتا ہے۔لیکن شیلا کے دل میں اس کی محبت آخر تک موجود ہوتی ہے۔اس کے علاوہ عائشہ اور علی کی محبت بچپن سے ہوتی ہے۔اور دونوں شادی بھی کر لیتے ہیں لیکن ان کی غربت کی زندگی میں رومان کے لیے وقت کم ہوتا ہے۔خالد اور نجمی کی محبت ہوتی ہے۔لیکن یہ یک طرفہ محبت ہے۔خالد نجمی سے محبت تو کرتا ہے لیکن نجمی کی محبت کا ایک الگ نظریہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس وہ مسعود سے بھی محبت نہیں کرتی،لیکن مجبوری کے تحت وہ اس سے شادی کے لیے راضی ہوتی ہے۔کیونکہ اس کی زندگی گزرتی جارہی ہے اور بڑھاپے کے طرف جارہی ہے۔اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس شادی کر لیتی ہے۔ناول میں اداس نسلوں کے مابین بھی محبت کے حوالے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور حتیٰ الوسع تاریخ کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ب: ناول "اداس نسلیں" کی نسائی کرداروں کا مطالعہ تانیثیت تانسائی رد تشکیل کے تناظر میں

i. ناول میں نسوانی کرداروں کی اہمیت

نسوانی کردار کی اہمیت صرف ناول میں نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی بہت زیادہ ہے ناول میں نسائی کرداروں کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ اس سے ناول میں ایک طرف رومانی فضا پید کی جاسکتی ہے تو دوسری طرف نسوانی کرداروں کے ذریعے ان کے مسائل مثلاً معاشرے میں عورت کا مقام،عورت کا استحصال،عورت کو بطور انسان تسلیم کرنا اور عورت کی آزادی اظہار رائے کو اُجاگر کیا جاسکتا ہے۔

ii. جنس اور تحفظ

نسوانی کرداروں کے بھی اپنے مسائل ہوتے ہیں ۔جس میں جنس اور تحفظ سب سے اہم مسائل ہیں۔عدم تحفظ کا احساس اس دور میں ہر فرد کے دل میں رہا کیونکہ وہ دور ہر لحاظ سے پر آشوب دور تھا اور خاص کر ہجرت کے دوران عدم تحفظ کا احساس بہت زیادہ تھا۔اس کے علاوہ عورت کی جنسی بھوک کا تذکرہ بھی ضروری ہوتا ہے۔عورت کی جنسی بھوک کا تذکرہ عبداللہ حسین نے بڑی باریک بینی سے کیا۔خاص کہ جب نعیم جیل سے آنے کے بعد پہلی بار بغیر جنسی فعل سے گزرتا ہے اور وہ جب نہیں ہوتے تو اس کی جدائی میں عذرا کی جو جنسی تشنگی کا احساس ہے اس کی تصویر کشی میں عبداللہ حسین نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

iii. عورت کی سماجی حیثیت

عورت کو بطور انسان قبول کرنا ہی دراصل مہذب شہری ہونے کا ثبوت ہے عورت معاشرے میں بطور انسان رہنے کی صدا بلند کرتی نظر آتی ہے۔وہ معاشرے میں کسی بھی فرد پر بوجھ نہیں بلکہ سہارا بننا چاہتی ہے۔ناول "اداس نسلیں" کا کردار عذرا عباس اور نجمی، دراصل معاشرے میں بطور انسان رہنے کی حسرت لیے پھرتی نظر آتی ہیں۔یہ معاشرے میں مرد کے برابر توجہ اور کام کرنا چاہتے ہیں لیکن سماج میں رائج تصورات اس کے سماجی رتبے کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے جیسا کہ نجمی اور عذرا کے ساتھ ناول میں دکھایا گیا ہے۔مرد کے ساتھ عورت کی بقاء جوڑ دینا دراصل سیدھا مردانہ سوچ کی عکاسی ہے۔سماجی اقدار کو پامال کرنے کے برابر ہے۔

iv. مرد کے حیوانی جذبات کی بھینٹ چڑھتے ہوئے نسوانی کردار

ناول میں ایسے نسوانی کردار موجود ہے جو مرد کے جنسی خواہشات کی بھینٹ چڑھتے ہیں کیونکہ یہ زندگی کے ان لوگوں میں ہے جن کو مرد اپنی حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اس ناول میں شیلا ایک ایسا کردار ہے جو بارہ سال کی عمر میں گاؤں کے سردار کے ساتھ سوتی ہے اور اس کے بعد دوسرے مرد بھی اُسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اس کے بعد نعیم بھی اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔اس کے بعد نعیم بھی اس سے جنسی خواہش کی تکمیل کرتا ہے۔یہاں پر وہ مردانہ سوچ قاری پر عیاں ہوتی ہے کہ عورت بطور جسم تک ٹھیک ہے اس کے علاوہ عورت کا سماجی رتبہ کوئی نہیں!

v. عذرا عباس

عذرا اس ناول کا مرکزی زنانہ کردار ہے اور اس ناول کی ہیروئن ہے وہ روشن علی خان کی بیٹی ہے اور ایک ایسے ماحول کی پروردہ ہے جو اعلیٰ اقدار اور روایات کا حامل ہے۔ اس کا ماحول نعیم کے ماحول سے بالکل متضاد ہے کیونکہ نعیم روشن پور کا رہنے والا ہے اور عذرا دہلی کے اس ماحول سے تعلق رکھتی ہے جس میں اعلیٰ جاگیر دار لوگ بھی اس ماحول میں اٹھتے بیٹھتے ہیں یعنی اس کا ماحول بہت ساری خوبیوں اور خامیوں کا حامل ہے۔ نعیم اور عذرا کی پہلی ملاقات اس تقریب میں ہوتی ہے جو اس کے والد کو روشن آغا بنانے کے لیے منعقد کی جاتی ہے۔

عذرا ایک خوبصورت لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے ایک آزاد اور بے مقصد زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ نعیم سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ عذرا کی زندگی ایک عام عورت کی زندگی نہیں ہے لیکن یہ بات اس میں موجود ہے کیونکہ وہ ایک عورت ہے کیونکہ اس کی زندگی میں وہ تمام مسائل موجود ہیں جو کہ ایک عورت کی زندگی میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر وہ خاندان سے بغاوت ہے یا جنسی جذبے کی عدم تسکین یا ماحول کا اثر جو بھی ہے عذرا ان مسائل کا شکار رہی کیونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک عورت ہے۔ عذرا ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مؤقف پر قائم رہتی ہے اور اپنے سے کم تر خاندان کے لڑکے سے شادی کر لیتی ہے۔

جس سے عذرا میں اِرادے کی قوت کا پتہ چلتا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ جو کرنے کا اِرادہ کرتی ہے اسے کر کے دِکھاتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ان کا تعلق ایک امیر خاندان سے ہوتا ہے۔ خوشیوں میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ نعیم بھی اس میں دلچسپی لیتا ہے جو نہ صرف جسمانی ساخت سے تعلق رکھتا ہے بلکہ نو عمری کی جذبات کی عکاسی بھی کرتا ہے اس کے علاوہ عذرا کی ابتدائی زندگی میں وہ بھرپور توانائی رکھنے والی لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے وہ محفل میں جان ڈالنے والی لڑکی ہوتی ہے اور ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ تمام لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے وہ محفل میں جان ڈالنے والی لڑکی ہوتی ہے۔

نعیم جب جیل سے واپس آتا ہے تو وہ عذرا کی جنسی تسکین نہیں کر سکتا یعنی جیل سے آنے کے بعد اس کی جو حالت ہوتی ہے وہ قابلِ رحم ہوتی۔ اس دوران عذرا اس کا ساتھ دیتی ہے اور اسے بھرپور کھانا دیتی ہے اور وہ دوبارہ اس قابل ہو جاتا ہے۔ جیل سے آنے کے بعد اس کی حالت کچھ یوں ہوتی ہے۔

"آہستہ سے وہ اس سے الگ ہو گیا۔ کچھ دیر تک دونوں مُردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہے۔ پھر عذرا نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ نعیم لیٹا لیٹا ہونٹ کاٹتا رہا حتیٰ کے رستے ہوئے خون کا نمکین ذائقہ اس نے اپنی زبان پر محسوس کیا۔ جیل کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔۔" اس نے خفگی سے کہا۔

جیل کے مضر کھانے کی وجہ سے ہے۔" نعیم کی آواز میں ابھی تک خفگی اور خفت کا اثر تھا۔ اس نے ہوا میں بڑی سی گالی دی۔ "میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کل شکار کے لیے جاؤں گا۔ گھوڑے کی سواری مرد کے لیے مفید ہوتی ہے۔" (۴)

اس دوران وہ اپنی تسکین کی فکر نہیں کرتی بلکہ اسے نعیم پر ترس آتا ہے کیونکہ وہ جیل کا کھانا کھا کر کمزور ہو چکا ہے نہ صرف جسمانی طور پر بھی بلکہ جنسی طور پر بھی۔ حالانکہ عذرا جنسی طور پر بھرپور عورت ہے اور کبھی کبھار تو یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی ضرورت پوری کرنے لیے نعیم کے پاس ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ ایک اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی آخر تک نعیم سے محبت کرتی ہے اور اس کا انتظار کرتی ہے لیکن جب نعیم سے کر اس کی زمین چھن جانے پر افسوس کا اظہار کرتی ہے تو اس کا یہ احساس بول اُٹھتا ہے۔

"ہندوستان میں بہت سے لوگوں کے پاس بہادری کے تحفے ہیں تم ان کے پاس جا سکتی ہو۔" (۵)

یہ عذرا کی محبت کی تذلیل ہے جس شخص سے اس نے سارے خاندان سے لڑ کر شادی کی اور جس نے خوشی حاصل کرنے کے لیے جلسے جلوسوں میں شامل ہوئی حالانکہ یہ اس کے رتبے کے خلاف تھا وہ شخص اتنے برسوں بعد کی وفاداری کے بعد بھی اس پر شک کر رہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کی توقیر صرف اس کے کر اس کی بنا پر تھی۔ حالانکہ یہ جذبات عذرا کے دل میں نہیں خود نعیم کے سینے میں تھے جو کر اس اور اس کی زمین کے بغیر خود کو اُدھورا محسوس کر رہا تھا نعیم کہ منہ سے یہ جُملہ سن کر وہ بھی چلا اُٹھی۔

"میرے باپ کا گھر ہے۔ میرے باپ کی زمینیں یہاں جو تم کھاتے ہو۔" (۶)

نعیم کے اس جملے سے عذرا کی عزت نفس مجروح ہوئی تھی اور وہ بے اختیار ہو کر کہہ گئی جو وہ کبھی کہنا نہ چاہتی تھی سب کچھ چھن جانے کے بعد نعیم خود کو بہت خالی محسوس کر رہا تھا وہ اپنا تقابل جب عذرا سے کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے اس سے بہتر ہے۔ زندگی کی اس موڑ پر جب نعیم مالی اعتبار سے کنگال ہو گیا تھا تو وہ خود کو عذرا سے الگ محسوس کرنے لگا ان دونوں کی دنیاؤں میں جو فرق تھا وہ واضح ہونے لگا۔ نچلے طبقے کے فرد ہونے کی وجہ سے ایک معمولی کسان ہونے کی بنا پر وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا۔

"وہ بے شرمی کی حد تک نفسانی اور خوبصورت تھی، وہ محبت کرنے والی عورت تھی وہ بہودہ عورت تھی، وہ اونچے طبقے کی عورت تھی، وہ برتر تھی، وہ تہذیب و تمدن کی عورت تھی وہ ایک نکما اور نادار، معمولی، بے حد معمولی۔" (۷)

نعیم کا احساس کمتری اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ وہ اس کی خوبیوں سے نفرت محسوس کرتا ہے کیونکہ عذرا کی خوبیاں اس کی محرومیاں بن کر سامنے آتی ہیں۔ اس جھڑپ نے عذرا اور نعیم کے فاصلے بڑھا دیے۔ کئی برس ایک دوسرے سے جُدا رہے۔ نعیم دوسری دفعہ جیل گیا اور ایک لمبی مدت کے لیے قید رہا۔ جیل سے رہا ہو جانے کے بعد وہ اپنے آبائی گاؤں میں رہنے لگا نعیم پر فالج کا حملہ ہوا اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ لیکن اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی عذرا کے دل میں اس کی محبت ویسی ہی تھی۔ فاصلوں اور دوریوں میں بھی اس کا دل قریب رہا۔ اس لیے جب عذرا نے یہ خبر سُنی تو کئی برس کی رفاقت اور محبت پھر سے جاگ اُٹھی۔ وہ روشن آغا کے پاس ہی رہتی تھی۔ نعیم کی بیماری کا سن کر وہ بے تاب ہو گئی اور دوسری طرف نعیم بھی اس کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ عذرا نعیم کو اپنے گھر لے آتی ہے روشن آغا کے گھر جہاں سب ہوتے ہیں۔

یہاں نعیم کی ایک اچھے ڈاکٹر سے بہتر دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔ عذرا اور نعیم پھر سے ایک ہو چکے ہیں وہ اپنے شوہر کا بہت خیال رکھتی ہے، اس کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہے۔ اب جب دونوں پھر سے ایک ہو چکے ہیں، عذرا کسی قیمت پر بھی اپنے شوہر کو پھر سے کھونا نہیں چاہتی، فاصلوں نے دونوں کی محبت کو پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ وہ شوہر کی محبت میں اتنی غرق تھی کہ اسے اپنے بہن بھائیوں، ماں باپ سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے تمام گھر والے اس کے معذور اور کنگال شوہر اور محبوب پر ترس کھاتے ہیں اور یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد نعیم کے ساتھ اپنے گھر منتقل ہو جائے۔

"میں نے تمھارے دل میں نفرت اور خوف کا بیج بویا ہے۔ میں نے تمھیں ذلیل کیا ہے سب کے سامنے۔ میں نے تمھیں ایک ہزیمت خوردہ زندگی دی ہے۔ تم ایک عظیم عورت ہو۔ میں نے تمھیں تباہ کر دیا ہے، محبت کے بدلے میں اب خود تباہ ہو رہا ہوں۔" (۸)

عذرا کا کمال یہ ہے کہ زندگی کی اتنی تلخیاں سہنے کے بعد بھی وہ اپنی محبت سے متنفر نہیں ہوتی۔ ہمیں اس کے کردار میں ایک مضبوط اور باہمت عورت نظر آتی ہے۔ اپنے پر آسائش زندگی کو چھوڑ کر نعیم کی مختلف زندگی میں شامل ہونا اور پھر اس طبقے کی تلخیوں اور اس کے خلاف اُمڈ آنے والی احساس کمتری کو نظر انداز کر کے عذرا نے پھر سے نعیم کو سہارا دیا۔ ہمیں عذرا کے اندر عورت کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں۔

باہمت، باشعور، وفاشعار، مخلص، ہمدرد، غرض عذرا کا کردار ہمیں بھرپور اور مکمل نظر آتا ہے۔

"درمیانی عمر کی یہ خوبصورت عورت اپنے طبقے کی خاص الخاص نمائندہ تھی اور زندگی میں اس نے محبت، نیکی اور مہربانی کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا اس قدر حیرت انگیز صلاحیت اس میں وقت کے صدموں کو برداشت اور نظر انداز کر دینے کی تھی۔" (۹)

یہ سچ ہے کہ عذرا نے قدم قدم پر اپنی محبت کے لیے قربانی دی ہے نعیم سے شادی کر کے اپنے خاندان کی قربانی دی، اس سے ناراضگی مول لی اور یہاں تک کہ وہ پر رونق اور پر آسائش دنیا جو اسے عزیز تھی وہ بھی قربان کر دی اور نعیم کے نظریات اور اس کے آردشوں کو اپنایا۔ وہ ایک مثالی بیوی ہے آغاز میں دیہات کی زندگی سے اکتا کر وہ بے زاری کا اظہار کرتی ہے لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ جو شخص دیہاتی زندگی کا عادی نہ ہو وہ اس سے اُکتا جاتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عذرا نے نعیم کے ساتھ ان تمام حالات کو بھی قبول کر لیا۔ اسی لیے نعیم بھی ناول کے آخر میں اس کی قربانیوں کا اعتراف کرتا ہے۔

"عذرا میری بیوی ایک عظیم عورت ہے اس کے پاس کوئی اندیشہ، کوئی اُلجھن، کوئی ریاکاری نہیں، وہ جو کچھ چاہتی ہے بلا جھجک اس کے لیے تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ انسان کی ساری شرافت سارے کرب اور ساری قربانی کے ساتھ خاموشی اور رضامندی سے زندہ ہے۔ خدا انسان کو اپنی شبیہہ میں بناتا ہے نا۔ وہ عذرا ہے۔" (۱۰)

پاکستان کی آزادی کے دوران عذرا اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان منتقل ہوتی ہے وہ اکثر نعیم کو یاد کرتی ہے جس کی کوئی خبر نہیں پہنچتی۔ لیکن مجموعی طور پر وہ مطمئن ہے۔ وہ جان چکی ہے کہ یہ وقت کا کھیل ہے جس پر کسی کا اختیار نہیں۔ انسان کا فرض بس یہی ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں ڈھل جائے۔ ماضی کے پچھتاوے اور مستقبل کے خوف کو دل سے نکال کر اپنی بے چینی اور اضطراب پر قابو پائے۔ یہی اس کی فتح ہے۔

"میں نے دل کی بے چینی پر فتح پائی ہے میرے اسرار کو کوئی جانتا ہے۔" (۱۱)

عذرا نے نعیم کی محبت میں بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مطمئن ہے، وہ نعیم کی محبت کے لیے جو بھی کر سکتی تھی، اس نے کیا، آج اس کا ضمیر کسی خلش میں بے قرار نہیں ہے۔ نعیم کی بے رخی کے باوجود اس کے دل میں محبت کبھی کم نہ ہوئی۔ عذرا اونچے طبقے کی عورت ہے، اسے زندگی کے تمام لوازمات میسر ہیں، وہ نعیم کے لیے یہ سب تیاگ سکتی ہے جبکہ نعیم اکثر مقامات پر اس سے بے وفائی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ عذرا کی چھوٹی بہن میں دلچسپی لیتا ہے یہ بھی سچ ہے کہ آخر میں وہ اس کی قربانیوں کا اعتراف بھی کرتا ہے لیکن رشتے کو نبھانے اور قربانیوں میں عذرا کا ہاتھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

vi. نجمی

نجمی ''اداس نسلیں'' کا ایک اہم نسوانی کردار ہے یہ روشن آغا کی چھوٹی بیٹی ہے جو عذرا کی پیدائش کے بیس سال بعد پیدا ہوئی یعنی یہ عذرا کی چھوٹی بہن بھی ہے اور اس کی بیٹی کی مانند بھی ہے اور وہ نہ صرف بیٹی کی طرح پیار کرتی ہے بلکہ پورے گھر میں عذرا ہی ان کو سمجھتی ہے۔ یہ کردار بھی عذرا کی طرح اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اور کبھی کبھار تو ایسا لگتا ہے جیسے ان میں عذرا کی روح سمائی ہوئی ہو۔ لیکن ان کے مزاج اور عذرا کے مزاج میں کافی فرق بھی ہے۔ عذرا ایک طرح کی چلبلی لڑکی تھی جبکہ نجمی ایک سنجیدہ اور زیادہ سوچنے والی لڑکی ہے۔ نجمی ایک الگ شخصیت رکھتی ہے یہ کردار روشن آغا کی طرح تیسری نسل سے تعلق رکھتا ہے اور تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے اعلیٰ خاندان کے تمام اقدار و روایات اس میں جذب ہو جاتے ہیں اور یہ تمام خوبیاں اور خامیاں اس نسل کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں اس میں شہرت کی بھوک نہیں ہوتی بلکہ ایک خاص رکھ رکھاؤ ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے کشش کا باعث بنتا ہے نجمی ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اور جاذب نظر آتی ہے۔

نجمی ایف۔ اے کرنے کے بعد فراغت کی زندگی گزارتی ہے اور وہ ایک مصورہ بھی ہے۔ اس کے اندر کا احساس فنکار بھی موجود ہے۔ نجمی زندگی کے بارے میں سوچنے والا کردار ہے ان کا نکتہ نظر اپنی بہن عذرا سے بالکل مختلف ہے بلکہ گھر کے دوسرے افراد سے بھی زیادہ مختلف ہے اور ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی طرح نہیں ہے بلکہ کبھی کبھار تو ان کے سوالات اور خیالات گھر والوں کو حیران کر دیتے ہیں۔

> ''یہ نجمی تھی جو حال ہی میں انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی اور آج کل بقول عمران کے عیش کر رہی ہے لیکن عمران کے ذہنی سطح سے ذرا اوپر اُٹھ کر دیکھا جاتا تو نجمی ایسے لوگوں میں سے تھی جن کے لیے عیش کا لفظ بے معنی اور گھٹیا ہوتا ہے وہ احساس کے اوپری سطح پر زندہ تھی۔ عمران اور اس طرح دوسرے لوگوں کے لیے اس کے دل میں محض ایک دائمی خاموش حقارت کا جذبہ تھا وہ ان سب کو ایسے لوگوں میں شمار کرتی تھی جو مستقل زندگی کی نچلی سطح پر کمینے پن کے سکون اور قناعت کے ساتھ رہے چلے جاتے ہیں اور چھوٹی بڑی آسائشوں کے حصول کی خاطر لاتعداد اندیشے دل میں اکھٹا کر لیتے ہیں اور اسے کھوکھلا کر دیتے ہیں جو ذہن اور روح سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور بالآخر فقط عمومی پن کے سوا کسی چیز کے قابل نہیں رہے۔'' (۱۲)

منفی جذبوں کا اہل نہ ہونا اس کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے وہ کسی سے نفرت نہیں کرتی لیکن وہ ہر شخص کو محبت کی اہل بھی نہیں سمجھتی اور اس کے نزدیک ہر شخص سے ایسی محبت نہیں کی جاتی ہے۔ جس کا تعلق روح سے ہوتا ہے کیونکہ روحانی اور دل و جان سے محبت وہ صرف اپنی زندگی کے ہم سفر سے کرنا چاہتی ہے۔

"ہم کسی سے محبت کے اہل نہیں ہوتے محبت جو سادگی اور سچائی کا جذبہ ہے جب آتا ہے تو ہمیں دنیا سے اوپر لے جاتا ہے یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہم کسی کی ذہنی یا جسمانی قوت کی مدد سے حاصل نہیں کر سکتے جو روح کی تمام قوتیں لے آتا ہے جس سے مذہبی رہنما گزرتے ہیں یہ ہمارے مخلص ترین جذبوں میں سے ہے میں جذبے کا انتظار کرتی ہوں۔" (۱۳)

"حقیقت سے گریز کردار کی ناکافی کا باعث بنتا ہے۔" (۱۴)

اور یہی نجمی کے معاملے میں بھی ہے۔ کیونکہ محبت کو اتنا بلند اور اعلیٰ جذبہ اور تجربہ سمجھنے والی لڑکی بھی زندگی سے یہ توقع رکھ رہی ہو گی کہ اسے بھرپور محبت ملے مگر اس کے باوجود ان کو وہ بھرپور محبت نہیں ملتی جس کی وہ تمنا کرتی ہے۔ انسانی زندگی کی ترقی میں ماں کا بڑا کردار ہوتا ہے لیکن نجمی کی زندگی میں ماں کی محبت سے محرومی بھی اس بات کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ محبت کو ایک اعلیٰ جذبہ تصور کرتی ہے اور ہر شخص کو اس لائق نہیں سمجھتی کہ اس سے محبت کی جائے اس کردار کی بھی محرومیاں ہیں۔

ماں کی محبت سے محرومی دوسری بہت ساری محرومیوں کی وجہ بھی بنتی ہے اور یہاں مرنے کو اس کا جی چاہنا بھی اس کی زندگی سے بیزاری کا ایک ثبوت ہے اور اس کی وجہ دوسرے لوگوں کا اس کی توقعات پر پورا نہ ہونا بھی ہے یعنی نجمی کی جو ذہنیت ہے وہ دوسروں کی نہیں ہے اس لیے اس کی طبیعت میں ایک طرح کی بے چینی بھی پیدا ہو گئی اور وہ کسی بھی گھر کے منظر سے اکتا کر کمرہ تبدیل کر دیتی ہے اور یہ بے چینی اس کی طبیعت میں اس لیے پیدا ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ خود کو دوسروں سے سے الگ سمجھتی ہے اور جب انسان کے دل میں الگ ہونے کی بات گھر کر لیتی ہے تو وہ پھر دوسروں سے کچھ الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی بھی ایک بے چین روح کی طرح گزر جاتی ہے۔

اس کی یہ بے چینی اس کی زندگی کے ساتھ رہی اور وہ چاہتی تھی کی اس کا ایک ایسا ہم سفر ہو جو اس اس کی خاندانی حیثیت دیکھ کر اس سے شادی کرے بلکہ وہ اس کا ہم ذوق ہو وہ اس کی دلچسپیوں کو برداشت کرے اور خود بھی اس میں دلچسپی لے۔ مخالف جنس کی بھرپور توجہ کے باوجود بھی نجمی ایک آئیڈیل کی تلاش میں تھی اور اس کے دل میں ایک راجہ رہتا تھا جو اس کے لیے ہو گا وہ محبت کے لیے انتظار کر سکتی تھی اور اس کی محبت کا نظریہ کچھ یوں تھا اور اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ ایک انسان ایسا بھی ہوتا ہے جو کبھی بھی کسی بھی وقت زندگی میں آ سکتا ہے اور آ کر وہ صرف محبت کرتا ہے اور وہ صرف محبت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

محبت کا یہ خاص نظریہ رکھنے والا کردار نجمی بھی زندگی میں عقیدت و احترام کے جذبے سے بھی بھرا ہے اس کے دل میں نعیم کے لیے بھی عقیدت و احترام ہے اور اس کو کبھی بھی عذرا کی نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ وہ ان کو الگ نظریے سے دیکھتی ہے وہ ان دونوں سے محبت کرتی ہے اور وہ ان دونوں کو الگ الگ شخصیت والے کردار تسلیم کرتی ہے۔

نعیم کی شخصیت سے وہ متاثر تھی اور اس کے دل میں ان کے لیے عقیدت و احترام کا جذبہ تھا۔ لیکن جب عذرا کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی تو نعیم وہی حرکت کرتا ہے جو شاید ہر فرد کی (سائیکی) نفسیات ہے وہ نجمی پر اپنی غلیض نظریں جمائے رکھتا ہے اور اس کا استحصال کرتا ہے۔

یہ کردار جب زندگی کی ناہمواریوں کا شکار ہو گیا تو اس نے زندگی کو سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے جسم کے مختلف اعضاء کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے بعد اس نے سوچا اس کا جسم ختم ہو رہا ہے وہ کمزور ہوتی جا رہی ہے اور ایک عورت اپنے جسم کے اثاثے پر فخر کر سکتی ہے شاید ایسا معاشرے کی وجہ سے ہو کیونکہ معاشرہ میں زیادہ عمر کی لڑکیوں کو جلدی قبول نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ مردانہ معاشرہ ہے۔

> "وہ کمرے کے وسط میں ٹانگیں پھیلانے آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے (برہنہ) کھڑی رہی بڑی دیر تک کے بعد آہستہ آہستہ ایک خیال اس کے ذہن میں جاگا۔ یہ ہماری ساری میراث ہے اس بارے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"۔۔۔۔۔۔کچھ دیر تک سُن رہنے کے بعد اس نے کپڑے پہنے اور لیمپ جلا کر آہستہ سنگار میز کے سٹول پر بیٹھ گئی۔ وہ کپکپا رہی تھی اس نے دیکھا کہ اس کے بال جو کافی عرصے سے گر رہے تھے بہت ہلکے ہو چکے تھے اور آنکھوں کے نیچے تھیلیاں بن گئی تھی اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھی اور جلد کا رنگ خاکستری ہو گیا تھا افسوس یہ نقصان عظیم کے کسی جذبے کے بغیر وہ وہاں بیٹھی شیشے میں دیکھتی رہی۔" (۱۵)
>
> "یہ کردار عذرا کی تشکیل نو یا زیافت ہے"۔ (۱۶)

اس لئے یہ کردار آخر میں عذرا کے راستے کو اپنا لیتی ہے اور اس کی شادی مسعود سے ہو جاتی ہے اور زندگی کو آئیڈیل کی نظر سے دیکھنے والی لڑکی کی بھی زندگی کے ہنگاموں کے سامنے ہار مان لیتی ہے اور زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی ہے کبھی کبھار تو یوں لگتا ہے جیسے ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے سے ناول میں رومانوی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوتا ہے۔

"نجمی آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتی رہی۔ خالد کی آنکھوں میں بے پایاں نرمی اور اداسی دیکھ کر ایک لحظے کے لیے اس کے دل میں نو عمری کے جذبات مچلے جنہوں نے اسے پریشان کر دیا۔ نو عمر کنوارے جذبات جو محبت کرنے والے انسان کے خلوص اور سچائی کا یقین دلاتے ہیں جو محبت کے خالص تصوراتی جذبے کو پہلی دفعہ اپنے سامنے پا کر ٹھٹھک جاتے ہیں اور روئیں روئیں میں بے ساختگی پیدا کر دیتے ہیں نجمی گھر آ کر نظریں اس پر سے ہٹالیں اور ادھر دیکھنے لگیں۔" (۱۷)

نجمی کا کردار ارتقائی پذیر ہے کیونکہ نجمی پہلے شادی پر یقین نہیں رکھتی ہے لیکن جب عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی مسعود سے شادی کر لیتی ہے نجمی کے حالات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کے حالات اکثر اس کے یقین کو بے یقینی سے ہمکنار کر دیتے ہیں اور اس طرح انسانی زندگی کے شب و روز جو لوگ آئیڈیل کی تلاش میں گزارتے ہیں۔ وہ بھی کبھی کبھار ایسے لوگوں کا سہارا تلاش کر لیتے ہیں جن کو خود سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نجمی کا کردار ناول کا ایک اہم نسائی کردار ہے۔ یہ نسائی کردار مردانہ سوچ کے ساتھ لڑتی نظر آتی ہے لیکن ایک عورت مرد کے ساتھ لڑ سکتی ہے لیکن سوچ یا نظریے کا سامنا کرنا اکیلے ممکن نہیں رہتا۔ اس لئے نجمی سمجھوتہ کر لیتی ہے یعنی شادی کر لیتی ہے۔

vii. عائشہ

عائشہ علی کی بیوی اور خالہ کی بیٹی ہے جو نعیم کی بھی خالہ ہے عائشہ کا کردار معصومیت لیے ہوئے ہے اور ساتھ ساتھ سادگی اور دیہاتی پن بھی اس کردار میں میں موجود ہے۔ عائشہ اور علی کا کردار گاؤں کے سیدھے سادھے اور آرائشوں سے پاک کردار ہیں۔ عائشہ کی زندگی اپنی ماں کے گھر میں تو آرام سے گزر رہی تھی اور جب وہ علی کو ملنے آتی ہے تو اس وقت وہ بہت چھوٹی ہوتی ہے اور وہ دونوں پتے جیب میں ڈال کر جا رہی ہیں۔

اس کی شادی جب علی سے ہو جاتی ہے وہ سدا کی بیمار رہنے لگتی ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارتی ہے علی اس سے بہت محبت کرتا ہے اس کا خیال رکھتا ہے اور کبھی کبھار جب زیادہ باتیں کرتی ہے تو اسے مارتا بھی ہے لیکن اس سے محبت بھی کرتا ہے عائشہ بہت زیادہ باتونی لڑکی ہے وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتی رہتی ہے اور کبھی کبھار علی اس کی باتوں سے تنگ آ کر پیٹنا شروع کر دیتا ہے اوہ نازک اور خوبصورت لڑکی ہے مگر گنوار ہے۔

عائشہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کو گاؤں کی زندگی سے محبت ہے وہ جب شہر آتی ہے تو وہ شہری زندگی سے اکتا جاتی ہے عائشہ ایک کسان کی لڑکی تھی اس لیے اس کے دل میں فطرت کے قریب رہنے کی خواہش ضروری تھی۔ اور وہ زیادہ باتیں بھی شاید اس لیے کرتی کہ اس سے اس کا شوہر خوش ہو۔ شاید اس کی زندگی کا مقصد یہی ہو کہ اس سے اس کا شوہر خوش رہے۔

"وہ ایک بد تمیز کسان لڑکی تھی جس کی زندگی کی واحد خواہش اپنے مرد کو خوش کرنا تھی اس قوی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس سے باتیں کرنے کے سوا کچھ نہ آتا تھا جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو علی چارپائی پر لیٹا چھت کو تک رہا تھا وہ پھر باتیں کرنے لگی۔" (۱۸)

آخر میں نعیم سے اس کی ملاقات ہجرت کے دوران ہو جاتی ہے اور نعیم سے بھی کہتی ہے کہ ہم تم کو یاد کرتے تھے اور جب بھی میں گاؤں جاتی ہو تو لوگ تمھارا پوچھتے ہیں ان کو یقین تھا کہ آپ ہم سے ملتے ہیں اور آخر میں جب یہ لوگ ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں تو عائشہ بے سود ہو کر گر جاتی ہے اور زندگی سے ہار جاتی ہے یہ انسانی زندگی کی بے حسی کہہ لیں یا ہجرت کی سختیاں کہ علی اپنی محبت کرنے والی بیوی کو چھوڑ کر پاکستان آتا ہے یا شاید وہ اس کی بیوی نہیں رہتی کیونکہ مرنے کے بعد انسان لاش بن جاتا ہے، انسان نہیں رہتا۔ علی کا اپنی بیوی کو وہیں چھوڑ کر پاکستان آنے سے اس کا کردار غیر مستحکم نظر آنے لگتا ہے۔ عائشہ کا کردار ایک جاندار کردار ہے مگر زندگی کی بے دردی اور حالات کی سنگینی نے اسے مردہ لاش بنا دیا ہے۔۔ عائشہ خوبصورت اور چلبلی لڑکی ہوتی ہے مگر وہ جب ازدواجی زندگی کی طرف آتی ہے تو اس کو بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں اور اس کی زیادہ تر زندگی انہی بیماریوں میں کٹ جاتی ہے علی اس کا خیال رکھتا ہے مگر وہ آخر کار ہجرت کے دوران مر جاتی ہے اور عذاب مسلسل سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔

viii. شیلا ماتھر (بانو)

شیلا اس ناول میں طبقاتی کشمکش میں پسینے والا کردار ہے۔ شیلا کا اصل نام شیلا ماتھر ہے۔ لیکن شیلا کے ساتھ جو بھی شادی کرتا وہ اس کو ایک نیا نام دیتا۔ ہندو کے ساتھ شادی کی تو اس نے ہندو کا نام دیا مسلمان کے ساتھ شادی کی تو اس نے مسلمانوں والا نام دیا نہ دیا تو کسی نے اس کو عزت نہ دی۔ مدن اس کا بھائی جب گھر سے فرار ہوتا ہے تو اس کے بعد معاشرہ اس کا استحصال شروع کر دیتا ہے اس وقت اس کی صرف عمر بارہ سال ہوتی ہے۔

شیلا کا جو کردار ہے یہ مزاحمت نہیں کرتا ہے لیکن سولات ضرور اُٹھاتا ہے جو کہ مردانہ معاشرے کے منہ پر تھپڑ کا کردار ادا کرتا ہے۔

"انگریز جو سب کے حاکم تھے وہ بھی عیسائی تھے، پتا نہیں ہم اچھوت کیوں تھے یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہم ان کے نزدیک بھی نہیں جا سکتے تھے۔ انگریزوں کے نہیں، گاؤں والوں کے چھوٹے بڑے سب کے نزدیک بس ہم جا ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر ہم غلطی سے کسی کے ساتھ چھو جاتے تو ہمیں اس کی سزا ملتی۔ لیکن سزا اسے بھی ملتی۔ یہ کہ جب جب تک وہ نہا دھو نہ لیتا گھر نہ جا سکتا اور جس کو چھو لیتا وہ بھرشٹ ہو جاتا۔ چنانچہ ہماری ناپاکی متعدہ بیماری کی طرح تھی۔" (۱۹)

شیلا اچھوت تھی جب گاؤں کا زمیندار اس سے اپنی ہوس پوری کرتا تو وہ اُس وقت وہ اچھوت نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس سے اس کی ہوس پوری ہوتی ہے اور گاؤں کا زمیندار یہ کام بخوبی انجام دیتا ہے۔

"زمیندار نے مجھے اپنے مہمان خانے بلایا اور باقی سب لوگوں کہ باہر نکال دیا۔ میں نے سوچا نہ ہو گا کوئی گائے برشٹ ہو گئی ہے اور اب یہ مجھے جان سے مارنے والا ہے۔ لیکن اس نے مجھے پاس بیٹھا لیا اور بولا۔'اری پگلی! عورتوں کے ساتھ سونے سے کوئی بھرشٹ ہوتا؟"(۲۰)

مرد عورت کو مذہب کی بنیاد پر نہیں نہ ہی ہمدردی کی بنیاد پر استعمال کرتا ہے اس اقتباس کی صورت میں مرد کو نہیں بلکہ ایک بھوکے درندے کو دکھایا گیا ہے کہ مرد کے دماغ میں عورت کے ساتھ صرف ایک سلوک وہ درندگی اور حیوانیت کے علاوہ کچھ نہیں۔

نعیم اور شیلا کے درمیان جو ربط اور سنجوگ قائم ہو جاتا ہے وہ جنسی اور حسی سطح پر نمایاں ہے اس میں ذہن اور روح کی کارفرمائی بالکل نہیں ہے۔

"دیر تک دونوں برابر لیٹے رہے ان کی سانسوں کی کئی ہلکی پھٹکار کمرے میں بلند ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے جوان صحت مند جسموں کی حرارت اور ہونٹوں سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک رینگتی اور سارے کمرے میں پھیلتی ہوئی محسوس کی۔" (۲۱)

"نعیم دانت پیس کر اس کا منہ بند کیا۔ شیلا نے اس کا ہاتھ ہٹایا اور ہونٹ دبا کر سسکی۔ اس نے نعیم کی چھاتی پر منہ رگڑا، اُسے چوما اور دیر تک تک سسکتی رہی۔ حتٰی کہ اس کی چھاتی جگہ جگہ سے بھیگ گئی۔" (۲۲)

نعیم کو مرنے سے بچانے والی لڑکی اور اسے دل سے محبت کرنے والی لڑکی شیلا زندگی کی محاذ پر ہمیشہ تنہا رہی۔ اسے نعیم نے چھوڑا تو زندگی میں جس نے بھی اپنایا۔ اس نے چھوڑ دیا اور پھر سے اکیلی رہ گئی وہ نعیم کو دل سے چاہتی تھی اور خود سے ملنے والے ہر شخص میں اسے دیکھتی رہی اور وہ جب علی سے ملتی ہے تو اس سے کہتی ہے کہ تم بھی اس جیسا چلتے ہو اور نعیم کو ہمیشہ یاد کرتی رہی۔

محبت کے جذبے کے تناظر سے اگر دیکھا جائے تو ناول میں ایک کردار جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ شیلا ہے جو نعیم کو ٹوٹ کر چاہتا ہے۔

شیلا نہ صرف محبت کرنے والی لڑکی ہے بلکہ اس کو یاد کرنے والی لڑکی بھی ہے ایسی لڑکی نہیں ہے کہ جو دوسرا مل گیا پہلا چھوڑ دیا۔ شیلا ایک وفادار لڑکی ہے مگر اسے جو لوگ ملے وہ وفادار نہیں۔ ہر شخص اپنی ضرورت پوری کر کے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ آخر میں اس کی شادی علی سے ہو جاتی ہے۔

ix. نعیم کی ماں اور سوتیلی ماں

یہ دونوں کردار ناول کے مرکزی کرداروں سے جڑے تو ہیں۔ لیکن ان کا کردار ناول میں زیادہ دیر تک پس منظر میں رہتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ کرنا لازمی ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ رہیں اور دونوں شوہر کی وفادار رہیں اس بات کا اعتراف گاؤں کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک سوکن دوسری کو برداشت نہیں کر سکتی ہے یہ عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ یہ دونوں بیویاں اپنے شوہر کی وفادار ہیں اور اپنی اولاد کا خیال رکھنے والی ہیں۔

x. عذرا کی ماں اور خالہ

عذرا کی ماں اور خالہ کا تعلق بھی ایک نیچ خاندان سے ہوتا ہے لیکن ان کی ماں بڑی ہوشیار عورت ہوتی ہے اور وہ ان کی شادی اعلیٰ خاندان میں کر دیتی ہے اور اس طرح یہ دونوں چور دروازے سے روشن آغا کے خاندان میں داخل ہو جاتی ہیں لیکن یہاں بھی ان کی زندگی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہوتی۔ اچھی سے مراد پر آسائش نہیں ہوتی بلکہ پر رونق اور پر محبت بھی ہوتی ہے۔ عذرا کی ماں اپنے بچوں سے دور رہتی ہے تو اس کے بچے اپنی خالہ سے اس طرح یہ دونوں اپنی اپنی جگہ تنہائی کا شکار ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ دونوں کردار زندگی کی رونق سے محروم ہیں۔

xi. فے (فہمیدہ بیگم)

فہمیدہ بیگم ایک چلبلی اور ایک متحرک کردار ہے اس کردار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بھی نجمی کی واحد دوست ہے اور نجمی جیسی لڑکی کا دوست ہونا کوئی معمولی بات نہیں کیونکہ اس کے تمام دوست نالائق ہونے کی وجہ سے اس بچھڑ گئے لیکن فے اس کے ساتھ ہے۔ فے کے کردار میں حرکت، مذاق اور سنجیدگی سب کچھ ہے تھوڑی دیر کے لیے ناول کی کینوس پر اپنا رنگ بکھیر کر چلی جاتی ہے۔

فے کا کردار زندگی سے لطف اُٹھانے والا کردار ہے۔

xii. زہرہ بیگم

زہرہ بیگم ایک نیک دل طوائف ہے جو لاہور میں علی کو بچا لیتی ہے اور صرف بچاتی نہیں بلکہ اپنی جان پر بنی رہنے کے باوجود بھی اس کا نام و نشان نہیں بتاتی کہ وہ گھر میں کہاں چھپا ہوا ہے۔ بازار میں مچنے والی بھگدڑ میں وہ بھاگ نکلتا ہے اور پولیس والے اس کے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور زہرہ کو مارنا شروع کر دیتے ہیں۔

زہرہ بیگم علی کی جان بچاتی ہے لیکن جب زہرہ بیگم ان کو گھر سے نکلنے کا کہتی ہے تو وہ دروازے کو دو تین لاتیں مار کر اُسے گالی دیتی ہے رنڈی!

"ادب کی نسائی رد تشکیل" میں نسرین انجم بھٹی اپنے مضمون میں لکھتی ہیں۔

> "مرد کی نظر میں عورت گالی ہے۔ تمام گالیاں عورت اور عورت کے جسم سے منسوب ہیں لکھنے والا خود Male Chauvinism کا شکار ہے۔ وہ اسے اپنی محبت نہیں ملکیت بنانا چاہتا ہے وفا کا مطلب ان کے ہاں Loyalty کا معاہدہ ہے۔ Allotment کا معاہدہ ہے اگر وہ اس سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے تو غلط کار ہے۔" (۲۳)

xiii. پرویز کی بیوی

پرویز کی بیوی کا رویہ گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ تو ٹھیک ہے لیکن عذرا اور اس کے شوہر نعیم کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ پرویز کی بیوی نفرت اور حقارت کا جذبہ رکھنے والی عورت ہے۔

ناول کا عنوان پسماندہ اور متاثرہ عوام کی طرف اشارہ ہے۔ ناول کا ہر سطر، ہر کردار ایک غیر یقینی خوف اور سماجی گھٹن کا شکار ہے۔ ناول کے مردانہ کردار معاشرتی جبر اور معاشی ناہمواری کے شکار ہیں کبھی مزارعے کی صورت میں کبھی نائی، موچی اور کم ذات قرار دے کر کاغذ کے طور پر جاگیرداروں کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں تھکے ماندے گھروں میں آتے ہیں تو اپنی محرومیوں اور اپنے اوپر ظلم و تشدد گھر کی عورتوں پر اتارتے ہیں۔ دراصل ناول کے تمام کردار لایعنیت اور بے معنویت کا شکار ہیں۔ ہر کردار ایک تلخ داستان لئے پھر رہا ہے۔ برصغیر کا معاشرہ طبقات کی زد میں ہے تو دوسری طرف جاہل مردوں کے زیر اثر نسائی کرداروں کو جانوروں کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ کبھی عورت جاگیردار گھرانے میں ظلم کا شکار ہے دوسری طرف کسان کی بیوی اپنے کسان شوہر کے ہاتھوں غیر انسانی روئے کا شکار ہے اس غیر یقینی حالات میں نسائی کردار سماج سے اپنا حق مانگتا نظر آتا ہے فرسودہ روایات سے بغاوت کرنے کا حوصلہ مند جذبہ بیان کرتا ہے۔ نسائی کردار کو برصغیر میں تیسری دنیا کے مرد ذہنیت نے نہ صرف اپنے لئے عیاشی کے سامان کے طور پر استعمال کیا ہے ناول نگار نے دراصل اپنے مشاہدے اور تجربے سے اجتماعی برصغیر کی عورت کی تصویر دکھائی ہے۔

ادیب علامت کہانیوں اور اشاروں میں دراصل جز کے ذریعے کل کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے اس طرح ناول نگار "اداس نسلیں" میں ایک امیر گھرانے کی عورتوں کے مسائل کو بیان کرتا ہے۔ عذرا عباس، نسائی کردار ایک نسائی مزاحمتی کردار کے طور پر آغاز سے دکھایا گیا ہے لیکن مردانہ سوچ کے حامل سوچ نعیم کے کردار کے سامنے بے بس نظر آتا ہے دراصل عورت کو معاشرتی رویوں نے کمزور ثابت کیا ہے عورت ذات پر بھروسہ نہ کرنے کی گمراہ کن افوائیں زور پکڑتی نظر آتی ہیں۔ برصغیر پاک وہند کا معاشرہ سیاسی و معاشی اور معاشرتی ناہمواری کا مسلسل شکار رہی ہے۔ اس لئے برصغیر کے عوام کو احساس کمتری کا احساس جینے نہیں دیتی۔ نعیم کردار ناول کے آغاز سے لے کر آخر تک احساس کمتری کا شکار رہا ہے۔

عذا عباس کے ساتھ رویہ، شیلا کے ساتھ رویہ صرف جسمانی تعلق اور عیاشی کے سامان کے حد تک رکھتا ہے۔ نعیم کا کردار دراصل ضرورت اور ابن الوقت کے عین مطابق ہے یہ کردار اپنے مقاصد کے لئے زندگی بسر کرتا ہے یہ اپنے جنسی تسکین کے لئے عورت کو بطور کاغذ استعمال کرتا ہے۔ "اداس نسلیں" ایک شاہکار ناول ہے اس ناول میں طبقاتی کشمکش، عدم مساوات، کسان، مزدور مسائل اور طرح طرح کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ دراصل "اداس نسلیں" اپنے عہد کی ناہمواریوں کی طرف اشارہ ہے۔ "اداس نسلیں" کا قاری بے معنویت کا شکار ہو کر اداس نسلیں کا ایک کردار محسوس کرتا ہے۔

"اداس نسلیں" عبد اللہ حسین کی وجہ شہرت بنا ہے اس کی وجہ فلسفیانہ موضوعات، تاریخ، سیاست اور عمومی صورت حالات بھی ہیں۔ اُردو ادب کے اصناف ادب میں ناول کا ذکر ہوتا ہے تو "اداس نسلیں" کسی نہ کسی صورت میں زیر بحث آتا ہے۔ یہ ناول کثیر موضوعات کا مجموعہ ہے۔ بیک وقت میں تاریخ، سیاست اور جنگ عظیم اول کے اثرات کا عکس قاری پر عیاں ہو جاتا ہے۔ "اداس نسلیں" کا نسائی کردار سماج سے سوال کرتا ہے کہ اکیسویں صدی ہو یا بیسویں صدی عورت نے مسائل کی نوعیت بدل رہی ہیں۔ یہی عورت دور حاضر میں حقوق کا مطالبہ کرتی بے بسی کا شکار ہے آج اکیسویں صدی میں عورت آزادانہ روشن خیال سماج میں بھی استحصال کا شکار ہے صدیوں سے روایات، مذہب اور سماجی پابندی کا شکار رہی ہے۔ عورت کی ذات عدم اعتماد اور بے بسی کا شکار رہی ہے لیکن انسان جدت کا متلاشی ہے۔ فرسودہ روایات سے بغاوت کرنا خطرات کے اصولوں کو جاننا اور سمجھنا اس کا وطیرہ رہا ہے آج غار سے لے کر انسان کمپیوٹر کے عہد میں سانس لے رہا ہے۔ یہ تبدیلی اور سماجی تاریخ کا ارتقاء فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔

"اداس نسلیں" کے نسائی کردار تانیثیت اور نسائی رد تشکیل کے تائید یا تردید میں نہ سہی لیکن ایک الگ متبادل بیانیہ دے رہے ہیں۔ "اداس نسلیں" اپنے موضوع کے حوالے سے اُردو ناول کی روایت میں انفرادیت کا

حامل ناول ہے۔ اس کے نسائی کردار مردانہ کرداروں کے سامنے سماجی اقدار کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ یہ کردار ایک دوسرے کی ضد میں نہیں لیکن سماجی مطالبات کا پرزور مطالبہ قاری سے کرتا ہے۔ اپنے عہدہ کی اجتماعی منظر نگاری کا کمال عبداللہ حسین کو حاصل ہے۔ عبداللہ حسین کے نسائی کرداروں کی خوبی یہ ہے کہ یہ تانیثیت اور نسائی رد تشکیل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اب تک محققین نے عبداللہ حسین کے ناولوں کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ایک تشنہ پہلو جو کہ یہ ہے کہ معاشرے میں اپنا وقار اور اپنی حیثیت منوانا نسائی کردار بدلتے سماجی تبدیلیوں کے عین مطابق اخلاقی رتبہ مانگتی نظر آتی ہے۔

عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" کے کرداروں کا اپنے عہد کے ساتھ آنے والے عہد میں ناہمواریوں سے موازنہ کرنا خاصا دلچسپ پہلو ہے۔ "اداس نسلیں" اپنے موضوع اور اسلوب کے تناظر میں شاندار ناول ہے۔ یہ ناول عبداللہ حسین کی وجہ شہرت بننا واقعی میں شاندار اضافہ ہے۔ ایک سچے ناول نگار اور بڑے ناول کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اپنے عہد میں برابر دلچسپی سے پڑھا جائے ناقدین ادب اب تک "اداس نسلیں" کی تعبیر و تشریح کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں، سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء، ص ۱۷۱

۲۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں، مشمولہ عبداللہ حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵۹

۳۔ محمد دین تاثیر، نثر تاثیر، مرتبہ فیض احمد فیض، اردو اکادمی، بہاولپور، ۱۹۶۳ء، ص ۵۲

۴۔ عبداللہ حسین، مشمولہ مجموعہ عبداللہ حسین، ص ۲۸۵

۵۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں، سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۸

۶۔ ایضاً، ص ۲۹۹

۷۔ ایضاً، ص ۳۰۳

۸۔ ایضاً، ص ۳۹۹

۹۔ ایضاً، ص ۴۱۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۸۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۰۹

۱۲۔ عبداللہ حسین، مشمولہ مجموعہ عبداللہ حسین، ص ۳۴۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۸۵

۱۴۔ عبدالحق حسرت لمگنجوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ادب، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۰

۱۵۔ عبداللہ حسین، مشمولہ مجموعہ عبداللہ حسین، ص ۴۹۴

۱۶۔ اسلوب احمد انصاری، اداس نسلیں، مشمولہ مجلہ انگارے (عبداللہ حسین نمبر) شمارہ ۷۰۔۶۷، سیّد عامر سہیل، جولائی تا اکتوبر، ۲۰۱۵ء ص ۱۴۷

۱۷۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، مشمولہ مجموعہ عبداللہ حسین، ص ۳۸۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۱۹۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں، سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء، ص ۴۹۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۲۳۔ فہمیدہ، ریاض، ادب کی نسائی رد تشکیل، مرتبہ چندہ سوال، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶، ص ۱۰۸

باب سوم:

” نادار لوگ“میں نسائی کرداروں کا مزاحمتی رویہ (نسائی رد تشکیل کے تناظر میں)

نادار لوگ ایک مطالعہ

ناول کا آغاز قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ آدمی کی یاد کا لنگر بھی کیا عجب منظر ہے۔ عبد اللہ حسین کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ قاری کو تاریخ جیسے خشک موضوع میں بور ہونے نہیں دیتا بلکہ ایک سائنسی تکنیک فلش بیک کے تناظر میں قاری کے سامنے ماضی اور حال لا کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ آدمی کی یاد کا لنگر دراصل کردار میجر سرفراز کے حالات واقعات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کیسے بیک وقت میں کن کن مراحل سے گزرتا ہوا کیسے سوچنے لگتا ہے۔ سرفراز یاد کے لنگر میں بے بس نظر آتا ہے علم نفسیات کے مطابق ماضی انسان کو بے چین کرتے ہوئے نفسیاتی بیماریوں کا سبب بنتی ہے انسان ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ ناول ”نادار لوگ“ ایک حسین یادوں کا عملی نمونہ ہے۔ ناول نگار نے اپنے عہد کی عصری مسائل اور سماجی تبدیلیوں سے بنتے ہوئے معاشرے کی اجتماعی تصویر سامنے رکھ دی ہے۔ عبد اللہ حسین کے ناول میں مشترکہ موضوع جو کثرت سے بیان ہوا ہے وہ اس کے عصری کردارو کا عصری تاریخ اور اجتماعی سماج کو درپیش مسائل، وہ مسائل جن کی وجہ سے سماج میں انتشار پھیلا ہے۔ معاشرے اور فرد پر اس اجتماعی مسائل اور انتشار نے جو ماحول برپا کیا ہے اس کی عکاسی ” نادار لوگ“ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

عبد اللہ حسین نے ایک عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے ناول لکھا ہے یہ وہ اجتماعی انتشار اور غیر یقینی حالات کا دور ہے جس میں سماجی ناہمواری کو ادیب شعراء اپنا مسئلہ سمجھ کر جبر کے حالات میں لکھا کرتے تھے ان سخت حالات و واقعات میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر جیسے مصنفین معاشرتی ناہمواریوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستانی معاشرہ مختلف قسم کے داخلی و خارجی مسائل کا شکار رہا۔ ایسے میں ایک وہ نسل بھی تھی جو پاکستان کے قیام میں جان ومال کی قربانیاں دے کر پاکستان میں معاشرتی ناہمواریوں کا شکار تھی۔ ان کی خواہشات اور قربانیاں کی قدر نہ کی گئی تو اس نسل کا المیہ بڑا دردناک صورت اختیار کرتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ جمہوری اصولوں سے خالی خالی محسوس ہو رہا ہے۔ ایسے میں ملک کا حساس طبقہ ادیب ادباء ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عدم تحفظ اور اظہارائے کی پابندی کا سامنا کرنا ایک باشعور اور مفرور شہری کے لئے مشکل عمل بنتا ہے تو ایسے میں ادیب اپنے فن کارانہ صلاحیتوں کا استعمال کر کے کنایوں اور علامت کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے حالات جبر

میں اکثر غیر ملکی تراجم کی مدد لے کر اپنے احساسات وجذبات پیش کرنا ادیب اپنا فریضہ سمجھ لیتے ہیں تاکہ غیر ملکی معاشرے کے حالات واقعات لکھتے ہوئے قاری کو اپنے عہد کا سیاسی وسماجی ناہمواریوں کا اندازہ عبداللہ حسین ایک سنجیدہ فکشن نگار ہونے کے ناطے اپنے قلم سے سماجی سچ لکھنے کی جسارت کرتا ہے۔اپنے ناول کا عنوان ''نادار لوگ'' رکھتا ہے۔عنوان کا اشارہ قاری کے ذہن کو پاکستانی معاشرے میں بڑھتے ہوئے اجتماعی انتشار اور غیر یقینی حالات کی جانب کراتا ہے۔'' نادار لوگ''کون ہوتے ہیں؟،''اداس نسلیں''کون سی اداس نسلیں؟''قید''کون سی قید؟ کس جرم میں قید کی سزا سنائی گئی ہے ؟ کس نے؟ کس کو سزا سنائی ہے ؟عبداللہ حسین کے ناولوں کے عنوانات سنجیدہ طالب علم کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں۔'' نادار لوگ'' کی کہانی ایک سے زیادہ موضوعات پر مشتمل ہے یہ نسلوں کا المیہ ہے بلکہ اپنے عہد میں سماجی ناانصافیوں کی ضد میں آنے والے لوگوں کا نوحہ ہے۔یہ میجر سرفراز ایک انفرادی ناول کا کردار نہیں دراصل یہ اپنے عہد میں ایک انسان دوست اور انسانی بنیاد پر ہمدردی رکھنے والے حساس انسان کی علامت ہے کہ ایک عام شہری کو جبر کے حالات میں سانس لینے کی کتنی بڑی قیمت چکا نی یا ادا کرنی پڑتی ہے۔یہ ایک استاد اعجاز کی کہانی نہیں بلکہ ایک سول انسان کی سوچ اور نظریے کی نمائندگی ہے کہ ایک ڈکٹیٹر کی زد میں ذاتی انتقام پر ایک خاندان پر کیا گزرتی ہے؟یہ ذاتی انتقام کے زد میں آکر معاشرے میں ایک پاگل اور نفسیاتی مریض بن کر دوسروں کو اپنی جنسی تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔

ناول'' نادار لوگ''،تقسیم پاکستان کے بعد کے معاشرے کی وہ اجتماعی تصویر دکھاتا ہے جس کی وجہ سے آج بھی پاکستانی معاشرہ مستحکم نہیں ہو سکا۔فوجی ڈکٹیٹر اور مارشل لاء نے جمہوری معاشروں کو کتنا نقصان دیا ہے؟ اس کی مثالوں سے قوموں کی معاشرتی تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔پاکستان کی معلوم تاریخ میں پہلا مارشل لاء ۱۹۵۸ء میں نافذ ہوا ہے اس دور کے متاثرہ نسل کی عکاسی اردو پاکستانی ناولوں میں ہوتی رہی ہے یہ وہ عہد ہے جس میں ادیبوں کو مختلف قسم کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اس عرصے میں پاکستان انڈیا کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کا واقعہ ادیب کے لئے اپنے زخم پر نمک ڈالنے کا کردار ادا کرتا ہے۔اب ایک نسل نے تقسیم ہندوستان کے سانحے کو برداشت نہیں کیا ہے کہ اوپر سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا واقعہ ہو کر نسل انسانی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ برصغیر پاک ہند میں وہ واقعات جو کہ فرد سے بڑھ کر اجتماعی صورت اختیار کرتے ہیں ان میں ۱۹۷۱ء کا واقعہ بھی ہے۔'' نادار لوگ''میں اس واقعے کی بہت اچھی طرح عکاسی ہوئی ہے۔

" نادار لوگ " کے نسائی کردار مختلف قسم کی مشکلات اور مسائل کا شکار نظر آتے ہیں۔ عورت ذات کو مصنف نے ناول میں بڑے عجیب و غریب صورت میں پیش کیا ہے۔ ہمارے ہاں دیہاتوں اور شہروں میں عورت کا کردار اور رتبہ کیا رہا ہے؟ دراصل ناول نگار نے وہ قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

پاکستانی معاشرہ دیہات پر مشتمل ہے۔ دیہاتوں میں آقا اور غلام کسان کا سلسلہ چلتا ہے تو ایسے میں جاگیر دار اور غلامانہ سوچ کی نمائندگی کا مظاہرہ " نادار لوگ " میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ پاکستان کے شہروں میں عورت کو دفتروں کی زینت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ دیہات میں عورت جاگیر دار کے گھر تو شہروں میں سرمایہ دار کے گھر کی لونڈی۔۔۔۔ ایسے میں ناول نگار کرداروں کے ذریعے دراصل اپنے معاشرے کا عمومی رویہ دکھانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں بیٹی، بہن اور بیوی کو تیسرے درجے کی مخلوق سمجھا گیا ہے۔ عورت ذات پر بھروسہ کرنا اور اس کے اعتماد میں اضافہ کرنا یہ عیاشی کے زمرے میں سمجھا جاتا ہے لڑکی کی پیدائش والے دن غم نہ سہی تو خوشی کا اظہار بھی نہیں کیا جاتا۔ پیدائش والے دن سے لے کر شادی دن تک لڑکی کو گھر میں بطور مہمان یا کسی دوسرے گھر کی امانت سمجھنا ہمارے اعلیٰ پڑھے لکھے ذہن کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ ناول نگار نے ان رجحانات کی عکاسی " نادار لوگ " میں کی ہے۔

ناول کا نسائی کردار " سکینہ " ماسٹر اعجاز کی بیوی کے طور پر ناول میں دکھایا ہے۔ گھر میں فرمانبردار بیوی، بہو اور ماں کا کردار نبھا رہی ہے۔ اپنے مجازی خدا کی خدمت اور اس کی ذات میں خوش نظر آتی ہے لیکن یہ مجازی خدا یعنی سکینہ کا شوہر جب اپنے مسائل کا شکار ہوتا ہے تو سب سے پہلے اپنی بیوی کو رد کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کنیز کے ساتھ تعلق بنانے کے بعد سکینہ کو انسان کیا بلکہ عورت جسم کے طور پر بھی قبول نہیں کرتا۔ یہاں پر ناول کا عنوان " نادار لوگ " کی عکاسی سکینہ کے کردار کی صورت میں نظر آتی ہے کہ ناول کا ہر کردار اپنی بے بسی اور ناداری کا المیہ لے کر پریشان حال ہے۔ لاچارگی اور بے چارگی کی عملی تصویر کے لئے سکینہ کا کردار کافی ہے۔

ناول کا دوسرا نسائی کردار کنیز جو کہ ایک لازوال کردار ہے یہ کردار اردو ناول کی روایت میں اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے۔ یہ کردار پڑھتے ہوئے قاری مرزا ہادی رسوا کے ناول " امراؤ جان ادا " کے نسائی کردار امراؤ کی طرف جاتا ہے کہ مجبوری اور حالات انسان کو کہاں سے کہاں لاتی ہے؟

امراؤ جان ادا ایک تہذیب کی نمائندگی ہے تو کنیز کردار بھٹہ مزدوروں میں ایک بے بس لاچار عورت کی " آہ " ہے۔ عبداللہ حسین کا یہ کردار ایک طبقاتی کشمکش اور معاشرتی جبر کا شکار ہے۔ مردانہ معاشرے میں عورت ہونا ظلم ٹھہرتا ہے۔ جب کنیز اپنے دکھ، درد اور اپنوں کے لئے عوام سے مدد کی اپیل کرتی ہے تو ایسے میں اعجاز

کالے کوئے کی طرح عورت کی جسم پر ٹوٹ کر گرتا ہے۔ اس کنیز کی مدد دراصل اس کو اپنی جنسی درندگی کا شکار بنانا ہوتا ہے۔ یہ کنیز کا کردار حالات کا شکار ہو کر یہ برداشت کرتی ہے۔ مزاحمت کی صورت میں اعجاز کا دوست بشیر اس کو شہر لے جا کر اپنی حوس کا نشانہ بناتا ہے۔ یہ کردار مردانہ حوس کا نشانہ بنتے بنتے اس قدر کمزور سے سخت جان بنتا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ میں سیاسی پارٹی میں آنے والی بھٹہ مزدوروں کے لئے یہ سب برداشت کر رہی ہوں کوشش کروں گی کہ کوئی دوسری کنیز ان جنسی درندوں کے ہاتھوں نہ لگے۔ دراصل یہ ہمارے مردانہ سوچ کے جاہل لوگوں کے منہ پر اجتماعی طنز ہے۔ ہمارے ارد گرد عورت کے بارے میں مختلف قسم کے تصورات و نظریات رائج ہیں۔ ان فرسودہ نظریات کو رد کر کے عورت کو بطور انسان سماجی رتبہ دینا ہو گا۔ آج بھی تہذیب یافتہ مرد عورت کو صرف بستر کی زینت اور گھر کی چار دیواری تک محدود رکھتا ہے۔ یہ دراصل سماج میں سماجی رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔

ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے اپنے عہد کی عصری تاریخ پیش کی ہے۔ ''نادار لوگ'' کے موضوعات اور فکری و نظری دائرہ کار کا پیمانہ وسیع تر ہے یہ انگریز سامراج اور ان سامراجی پالیسیوں کے زیر اثر سماج کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کا آنا اور ہندوستانیوں کی اجتماعی سوچ اپنی حکمرانی کرنا ایک زندہ سچ ہے۔ سامراجی پالیسی میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ غلام قوم ذہنی وجسمانی اور روحانی غلامی سے آزاد نہیں رہ سکتی۔ قوموں کے معاشی و سیاسی شعبے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ قومیں اجتماعی ترقی کی دوڑ میں زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ حسین جنگ عظیم اول سے متاثرہ لوگوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتا ہے۔ یہ دو جنگیں جن کے اثرات دنیا بھر نے محسوس کئے ہیں ان میں زیادہ تر قومیں ذہنی و روحانی اور معاشی و سیاسی مفلوج ہو کر تباہ ہو گئیں ہیں۔ یہ ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے خود کشی کے برابر رہی ہیں۔ ان جنگوں نے دنیا کو کیا دیا ہے؟ یہ سب جنگیں کیوں؟ اپنی طاقت اور دوسروں کو غلام بنانے کے لئے لڑی گئی ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان کو ان جنگوں جیسے نہیں لیکن مشکل حالات کا سامنا رہا ہے۔ ملک میں بار بار فوجی مارشل لاء، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور سیاسی قیادتوں کو سرِعام پھانسی دے کر معاشرے کو عدم مستحکم صورت حالات کو پہنچایا ہے۔ ان تمام تر حالات واقعات کی عکاسی ''نادار لوگ'' میں بخوبی ہوئی ہے۔

بڑے ناول نگار کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے تناظر میں اپنے مشاہدے اور تجربے کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناول کی فضا تخیل پر مشتمل ہوتی ہے ممکن ہے کہ ناول میں رومانوی کہانی بھی ہوں لیکن ایک سنجیدہ ادیب کھوکھلے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا وہ تو ناول میں بہت ساری سچائیاں قاری پر عیاں

کرتا ہے۔ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات اوراپنے معروض میں سماجی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے سماج کی عکاسی ان حالات واقعات میں عصری تاریخ کے تناظر میں غیر جانبداری سے مشاہدہ و تجزیہ کرنا ہے۔ ادب ہر دور میں اپنے عصری تاریخ کے مسائل کا ترجمان رہا ہے۔ ناول ادب کی وہ صنف ہے جس میں اپنے عہد کی بھرپور اجتماعی شعور کی ترجمانی ممکن ہے ناول " نادار لوگ "عبد اللہ حسین کا یک ایسا ناول ہے جس میں برصغیر کے وہ تاریخی واقعات اور ان واقعات سے پیدا ہونے والے حالات کی ترجمانی ملتی ہے جو کہ برصغیر اور خصوصاً پاکستانی سیاست میں اہمیت کے حامل ہیں۔ "نادار لوگ" بے بس، بے کس، مجبوراور لاچار لوگوں کی روداد ہے جو کہ ان کرداروں پر بیت گئی ہے۔ عبد اللہ حسین تاریخ انسانی کا ایک سنجیدہ لکھاری رہا ہے معاشرے کا ایک حساس ادیب ہونے کے ناطے اپنی تحریروں میں سماجی ناہمواریوں کو انسانی سماج میں ترقی و فلاح میں رکاوٹ سمجھتا ہے ناول میں ان کی عکاسی ہوتی نظر آتی ہے۔

کسی ملک میں مارشل لاء کی ضرورت کیوں محسوس کی جاتی ہے؟ آمریت اور صدراتی نظام کا تقاضا کیوں کر کیا جاتا ہے۔ دراصل ڈکٹیٹر یا فوجی ڈکٹیٹر معاشرے میں عوام کے چنے ہوئے لوگوں پر مختلف طریقوں سے عدم اعتماد کا ماحول برپا کرتی ہے۔ نا اہل، نالائق اپنے لئے دولت بنانے اور اپنے آل کے لیے سوچنے کا عذر بنا کر پیش کرتے ہیں کہ آپ کے ووٹ سے آنے والے سیاست دان عیاشی کرتے ہیں اور تم لوگ تباہ ہو کر رہ گئے ہو۔ تمہاری نسلیں تباہ ہو کر رہ گئیں ہیں تو ایسے میں فوج یا فوجی ڈکٹیٹر ہی واحد حل ہے۔ پاکستانی معلوم سیاسی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ ریاست کے نمائندے ملک کے جمہوری ایوانوں میں چور دروازوں سے زبردستی داخل ہوتے ہیں۔ پاکستانی معاشرتی تاریخ اس کی نمائندگی کرتی ہے۔

" نادار لوگ "میں ایک مکمل اداسی بیگانگی کی فضا چل رہی ہے ناول کا کردار ہر سطر اپنی بے بسی اور لاچارگی کو بیان کر رہا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار اعجاز اور میجر سرفراز ایک کرب اور بے چینی کا شکار ہیں ایک ایسا معلوم اور نامعلوم سے درد کہ بھائی بھائی کو بتانے سے قاصر ہے لیکن جس طرح دونوں کو باہر پھینک دیا جاتا ہے تو دونوں کی حیثیت معاشرتی کچھ بھی ہوں لیکن اپنے اندر روز مرتے نظر آتے ہیں۔ جب اعجاز اور سرفراز اپنی حالت بتانے سے کتراتے نہیں ایک دوسرے کے ساتھ اپنے اوپر ہونے والے ظلم و تشدد بیان نہیں کرسکتے تو قاری کو غالب کے شعر کا مصرعہ یاد آنے لگتا ہے کہ:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

قاری کو غالب کی عظمت کا شعر اور " نادار لوگ " کے دونوں کرداروں کا دکھ اس شعر کے ذریعے واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح اپنے اپنے ادارے سے نکلتے ہیں ؟ کس جرم ہیں ؟ اس کے بعد ان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی میں کن کن مسائل کا اضافہ ہوتا ہے یہ سب پڑھنے اور سمجھنے کے لئے " نادار لوگ " کا مطالعہ ایک شرط ہے۔

" نادار لوگ " میں کردار بولتے نہیں بلکہ چیختے نظر آتے ہیں۔ " نادار لوگ " میں لوگوں کے اجتماعی رویوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نسرین کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو کہ معاشرے میں کبھی روشن خیالی کی بنیاد پر کبھی انسانی بنیادی ہمدردی کی بنیاد پر جنسی، ذہنی اور جسمانی تشدد کا شکار ہے۔ بوڑھا کرنل نسرین کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کو معاشرے میں اچھا خوبصورت گھر، خوبصورت لباس دیتا ہے لیکن اس کے بدلے یہ بوڑھا کرنل چپکلی کی طرح اس کے جسم پر پڑا رہتا ہے۔ دوسری طرف میجر سرفراز اس کو اپنی حوس کا نشانہ بنا رہا ہے تھوڑی سی مزاحمت پر یہ کردار مردانہ کمزوری کے حامل شخص سے منہ پر تھپڑ کھاتا ہے۔ جس پر یہ کردار سماجی حیثیت اور مہذب معاشرے میں عورت کے رتبے اور مقام پر سوالات اٹھاتا ہے۔ یہ سماجی طنز در اصل جاہل معاشروں پر ہوتا آرہا ہے۔ " نادار لوگ " کے کردار اور موضوعات آسمانی نہیں بلکہ ہمارے اردگرد کے لوگوں کے تجربات و مشاہدات کی عکاسی ہے۔ معاشرہ انسانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک ترقی یافتہ سماج کی صورت تب ممکن ہے جب ہر فرد عورت کو سماجی حیثیت حاصل رہے۔ جاگیر دارانہ سماج کی باقیات اور کینسر جیسی بیماری اتنی جلدی ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہر دور میں چلتی رہی ہے۔

" نادار لوگ " میں بھٹہ مزدوروں کے مسائل اور وسائل ضروریات زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کنیز کی طرح مردوں کے مسائل کو بخوبی پیش کیا گیا ہے ۔ " نادار لوگ " المیہ ہے اُن کرداروں اور زندہ جاوید موضوعات کا جن کو اردو ادیبوں نے مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ " نادار لوگ " میں کثیر موضوعات اور کثیر کرداروں کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے پاکستان کا پہلا مارشل لاء اور صدر ایوب کے دور کے سماجی ناہمواریاں کنایوں اور اشاروں میں بیان کیے ہیں۔ کسی معاشرے میں سیاسی و عسکری قیادت کی نااہلی اور ذاتی انتقام حساس طبقے پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے اس کے لئے " نادار لوگ " کا مطالعہ لازمی ہے۔

" نادار لوگ " میں ٹریڈ یونین یعنی فلاحی ترقی اور سماج میں برابری کے حقوق کی تحریک کے اثرات اور واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ دوسری صرف ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس کی رپورٹ کا تذکرہ بڑا معنی خیز ماحول پیش کرتا ہے اس حصے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے عہد میں سیاست اور سماج کو کس قدر پڑھا ہے اور دیکھا ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ غیر جانبداری سے اپنے عہد کی عصری تاریخ کو آنے والی نسلوں کے سامنے لاتی ہے۔ اردو ادب میں " نادار لوگ " اپنی انفرادیت اور نوعیت کے حوالے سے یادگار اضافہ ثابت ہوا ہے۔

الف: عبداللہ حسین کے نسوانی کرداروں کے مزاحمتی افکار

ادب کا مطالعہ کرنا دراصل زندگی کا مطالعہ کرنا ہے۔ ادب میں دوسروں کے تجربات اور واقعات کو پڑھنا ہوتا ہے۔ ادب کی اصناف بدلتے دور کے ساتھ بدل رہی ہیں تو ایسے میں قصہ یا کہانی کی جدید اور مقبول صنف ناول میں نت نئے تجربے ہو رہے ہیں انسان زندگی میں جدید اور ترقی کا متلاشی ہے۔ پہاڑوں یا غار کے دور سے لے کر جدید طریقوں سے سفر اور زندگی کو آسان بنا رہا ہے لیکن اب بھی انگریزی میں "Once upon a time" ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک تھا راجہ، ایک تھی رانی، ایک تھا بادشاہ وغیرہ جیسی قدیم سوچ کا مالک ہے لیکن اب مہذب اور ترقی یافتہ و ترقی پذیر ممالک ہیں ناول اپنی ذاتی نوعیت اور انفرادیت کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔ اب ناول نے سماج میں با قاعدہ کیپسول یا انجیکشن کے طور پر اپنی حیثیت منوائی ہے۔ ناول نے قوموں کی معاشرتی تاریخ میں اور سماج میں با قاعدہ آکسیجن کا کردار ادا کیا ہے۔

انسانی سماج مرد اور عورت کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسانی سماج میں عورت کی سماجی حیثیت و مقام واضح ہوتا ہے۔ مرد اپنی جگہ ایک حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ دونوں مل کر انسانی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ دونوں ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں کے باہمی اتحاد سے معاشرہ صحت مند معاشرے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ کسی معاشرے میں گھٹن اور حبس کا ماحول کب بنتا ہے؟ جب دو مخالف وجود رکھنے والوں کے ہاں شدت اور خود اعتمادی جنم لینے لگتی ہے تو اس طرح معاشرہ تضادات کا شکار ہو کر ترقی کی بجائے زوال کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اردو ناول ''مراۃ العروس'' سے لے کر موجودہ دور تک عورت کے موضوع پر بات کرتا نظر آتا ہے ناول نگاروں نے سماج میں عورت کے مسائل اور اس کی حیثیت کو بیان کیا ہے۔ اردو ادب میں صنفی امتیاز اور تانیثی یا مردانہ کرداروں کا مباحثہ زور پکڑ رہا ہے ایک طرح سے یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس سے سرمایہ ادب کے مختلف پہلوؤں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ادب میں دو جمع دو چار نہیں تو اس طرح کوئی قیمت بھی نہیں تو اس طرح ادب اور فن پارے کی کثرت معنی سامنے آنے لگتے ہیں۔ ایک سوال کیا جاتا ہے کہ اردو ادب میں عورت کو بطور انسان نہیں بلکہ ایک جسم، طوائف، لونڈی اور گھر کی چار دیواری تک محدود کر کے دکھایا ہے۔ اس رویے سے عورت کو سماج میں پردے اور ذمہ داریوں کا پابند بنایا ہوا ہے۔ اس لئے معاشرے میں حقوقِ نسواں اور مزاحمتی رویوں کا اظہار با قاعدہ فکری محاذ پر ہوتا نظر آتا ہے۔ اردو ناول نگاروں کے ہاں عورت کا کیا مقام ہے اس موضوع پر سندی تحقیق کی بہت مثالیں سامنے آسکتی ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناولوں میں خصوصاً'' نادار لوگ ''میں عورت کہاں کھڑی ہے؟ یا کہاں لیٹی ہے؟ اس کی بہترین عکاسی کرنا دراصل ایک خوفناک حالات و واقعات کی طرف اشارہ

ہے۔ عورت سماج میں بطور انسان رہنا چاہتی ہے۔ کسی پر بوجھ نہیں؟ کسی کی مخالف نہیں بلکہ بطور انسان معاشی طور پر آزاد تو ایسے میں مشکل کیوں؟ تانیثیت اور نسائی رد تشکیل فکری محاذوں پر ان سوالات کو لے کر جارہی ہیں جدید ادب میں ان رجحانات کو خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ ''نادار لوگ'' میں عورت کے مزاحمتی رویے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ یہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم و تشدد اور معاشی غلامی کی آواز بلند کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک بھٹہ مزدور کو کس قدر سہولیات زندگی مہیا ہونگے؟ اس لیے ناول نگار نے ''نادار لوگ'' میں مزدور اور بھٹہ کسانوں کی عزت اور جاگیرداروں کا بطور جانوروں اور درندوں والا رویہ دکھایا ہے۔ کنیز، سکینہ، نسیمہ اور نسرین دراصل عورت مزاحمت کی علامتیں ہیں جو کہ قاری کی توجہ ناول سے ہٹا کر اپنے معروض میں عورت کے ساتھ برتاؤ کی طرف لاتے ہیں۔ انسانی معاشرہ، تضادات کا شکار ضرور ہے لیکن ان تضادات اور انسانی بقاء کی وجہ سے انسان آج غار سے لے کر کمپیوٹر کے عہد میں سانس لے رہا ہے اب انسان اپنے وجود اور موجود سے مطمئن نہیں تو یہ ترقی اور فلاح کا سفر چاند پر جانے کی ترقی کا سوچ رہا ہے۔ ''نادار لوگ'' کے مظلوم لاچار عورت کا کردار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک صحت مند انسانی معاشرہ بننے سے بہت فاصلے پر ہے۔ عورت مزاحمت کی تحریکوں کے اثرات ''نادار لوگ'' کے نسائی کرداروں میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

نسوانی کرداروں کی نفسیات کو سمجھنا قدرے مشکل ہے نسوانی کردار کی تفہیم و تشریح جدید تنقیدی نظریات کے تناظر میں پرکھا جارہا ہے۔ نسوانیت ایک رویہ ہے جو کہ عورت ذات سے منسوب ہے۔ عورت کے مختلف سماجی رتبے ہیں۔ لیکن تاریخ انسانی میں عورت کا ارتقائی سفر جاری ہے۔ اس عورت کے مسائل پیچیدہ صورت حال اختیار کئے ہوئے ہیں کبھی بیٹی کی صورت میں، کبھی بیوی کی صورت میں تو کبھی ماں کی صورت میں سماجی ناہمواریوں یا ذمہ داریوں کا شکار نظر آتی ہے اس سماجی ناہمواری یا ذمہ داری کا عورت مرد ذات پر کیوں نہیں یہ سوالات تانثیت کے تنقیدی نظریات میں اہم سوال تھا اب یہ سوال باقاعدہ صحت مکالمے کی صورت اختیار کئے جارہا ہے یہ دور جدید کے تناظر میں صنفی امتیاز کو چھوڑ کر سماج میں بغیر کسی تفریق کے معاشرتی کردار ادا کررہا ہے۔ آج یورپ سے لے کر پاکستان تک عورت مرد کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آرہی ہے اپنی تمام تر ذمہ داریاں نبھارہی ہیں لیکن آزاد خیال اور روشن خیال سماج میں بھی یہ عورت اپنی بقاء اور حیثیت پر سوالات اُٹھارہی ہے۔ آج عورت کو بطور عارضی بنیاد یعنی نظریہ ضرورت یا نظریہ اشتہار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

آج عورت کو جدید ٹیکنالوجی کے ہوتے ہوئے بھی وہی قدامت پسند اور رجعت پرستوں کے استحصال کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ لیکن ان حالات واقعات کے باوجود معاشرتی حقوق اور سیاسی معاشی حقوق کے لئے عورت

باقاعدہ مزاحمت تحریکوں کے ساتھ برابر حصہ لے رہی ہے۔ عورت کو تیسرے درجے کی مخلوق قرار دے کر اس کو ضرورت وقت کے تحت استعمال کیا گیا ہے۔ اب نسائی رد تشکیل کا دور ہے اس میں عورت حقوق کی صدا بلند کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی آزادی مانگ رہی ہے بلکہ یوں کہنا غلط نہیں ہو گا کہ عورت نے جو پہلی حقوق کی تحریک تانیثیت سے شروع کی تھی وہ اپنے حقوق کے تحریک میں کامیاب رہی ہے اب عورت اپنے اوپر کوئی سماجی پابندی برداشت نہیں کر رہی ہے۔ لیکن پاکستان کی آبادی کا بڑا حصہ دیہات پر مشتمل ہے تو ایسے میں عورت کے مسائل اب تک تانیثیت کی حد تک موجود ہیں۔ ہمارے ادیب حضرات عورت کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے ایک عورت کا کردار قاری پر عیاں کرتے ہیں کہ شہروں کے بجائے دیہات کی عورت اب تک حقوق کے حصول کے لیے دھکے کھائے جا رہی ہے۔

'' نادار لوگ'' میں بھی سکینہ کا کردار اپنے احساس اور جذبے کے لحاظ سے صرف اپنے کنبے سے منسلک ہے۔ وہ ہر لحظ اپنے گھرانے کی روشن مستقبل کے بارے میں سوچتی رہتی ہے، اُسے فکر ہے تو صرف اس بات کی کہ اس کے گھر کے تمام افراد ہر آفت سے محفوظ رہیں۔ علاوہ ازیں ایک وفادار عورت کی طرح اُس کا سب کچھ اپنے شوہر (اعجاز) سے منسوب ہے۔ کنیز کا کردار باغی ہے مگر اُس کی بغاوت مثبت انداز میں سامنے آتی ہے۔ وہ جس ماحول میں رہ رہی ہے اس میں وہ ذہنی اور جسمانی استحصال کا شکار ہے۔ لہذا کنیز غلامی جیسی لعنت سے چھٹکارا پانے کے لیے بھٹہ مزدوروں کے ڈھیرے سے بھاگ جاتی ہے۔

قاری کے سامنے کنیز کا کردار اور نسرین کا کردار دو مختلف رجحانات اور طبقات کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ کنیز جو کہ اپنی معلوم زندگی سے لے کر آخر تک مرد ذہنیت کے زیر اثر رہی ہے ہار نہیں مان رہی ہے مسلسل ایک مردانہ سوچ اور نظریے کے خلاف لڑتی نظر آتی ہے مردانہ سوچ میں کنیز کے ساتھ ہمدردی دراصل انسانی معاشرے میں مردانہ سوچ کے حامل درندوں کا اصل چہرہ سامنے لا رہی ہیں کہ کس طرح بے بس کمزور عورت کو مرد اپنے پاس عیاشی کے سامان کے طور پر رکھتا ہے اور ان حالات واقعات میں عورت کیا سوچتی ہے؟ یہ اشارہ ہے ایک مظلوم کی آہ کی طرف۔ ایک مسلسل بے بسی اور مردانہ سماج پر طنز کنیز کی صورت۔ دوسری طرف نسرین ہے جو کہ آزادی اور روشن خیالی کی آڑ میں مردانہ سوچ کے زیر استحصال ہے۔ اس کو ہر قسم کا مرد اپنی عیاشی اور جسمانی تعلق کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ یہ ایک علامت ہے کہ روشن خیال طبقے میں ایک بے بس عورت کو صاف کپڑے پہنا کر کس قدر اذیت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے؟ یہ کردار دراصل جنسی درندوں کا چہرہ دکھانا چاہتا ہے اس طرح ہمارا اجتماعی معاشرتی رویہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں عورت کبھی روایات کے نام کبھی مذہب کے نام پر، کبھی غیرت کے نام اور کبھی آزادی اور روشن خیالی کے نام پر جنسی عمل کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

ناول ''نادار لوگ'' عنوان کی طرح ہر کردار بھی ناداری اور بے بسی کا شکار نظر آتا ہے۔ یہ کردار مردانہ ہوں یا زنانہ انسانی رویے اور غیر انسانی رویے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کے نسائی کردار ظلم و تشدد کا شکار ان بے بس لاچار مردوں کے ہو رہے ہیں جو کہ معاشرے میں اپنا حق نہیں مانگ سکتے۔ جو کہ کبھی ظالم جاگیر دار اور اپنے متعلقہ آفسروں سے اپنی غلطی نہیں پوچھ سکتے ہین لیکن گھر کے اندر شیروں کی طرح اپنی عورتوں کو معاشرتی رویوں کی صورت میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ ناول کو پڑھتے ہوئے قاری پر عیاں ہوتا ہے کہ '' نادار لوگ'' کے نسائی کردار ایک کردار کا المیہ نہیں بلکہ یہ تو اپنے عہد میں عورت مظلوم اور مرد کی بے حسی کی اجتماعی تصویر لئے پھر رہی ہیں۔ اجتماعی تصویر کی اس طرح کہ ہمارے معاشرے میں مرد ذات گھر کے باہر عورت کو دیکھتے ہی اس کا پوسٹ مارٹم آنکھوں سے شروع کر دیتا ہے کالے کوے کی طرح معاشرے میں ہر عورت کو اپنے قابو کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ عورت کو معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس ان درندوں کی وجہ سے محسوس ہونے لگتا ہے۔ '' نادار لوگ'' کا کردار ''سکینہ '' اعجاز کی بیگم ایک گھریلو عورت ہے۔ گھر کے معاملات اور مسائل میں الجھی ہوئی۔ اپنے خاوند کی تابع فرمان بیوی ہے۔ اپنے مجازی خدا کو خوش کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے والی۔ دوسری طرف اس کا شوہر آسان الفاظ میں مجازی خدا جب معاشرے میں معاشرتی و معاشی بحران کا شکار ہوتا ہے تو اس کا پہلا نشانہ اپنی بیگم پر ہوتا ہے۔ سکینہ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کم توجہ اور کم بات کر کے اپنی بیوی کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے لگتا ہے یہ بھی ایک قسم کی نفسیاتی جبر کی نشانی ہے کہ اپنے ذاتی مسائل اور ناہمواریوں کی وجہ سے گھر میں اپنی بیگم کو رد کرنا۔ یہ مجازی خدا ایسے حالات میں باہر پرکشش اور بے بس عورت (کنیز) کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرنے لگتا ہے تو گھر کی مرغی دال برابر سمجھ بیٹھتا ہے۔ یہاں پر مرد کا وہ وحشیانہ چہرہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے جو کہ عورت کو صرف عیاشی کے سامان کے طور پر لینا جانتی ہے۔

مردانہ سوچ کا المیہ دراصل یہی ہے کہ اسے عورت جنس کے علاوہ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ مجسمہ سازوں سے لے کر فلم ڈرامہ اور کتابوں میں دیکھا جائے تو ہمیں عورت ذات صرف جنسی تسکین کے طور پر ملتی ہے یہاں پر ''نادار لوگ'' میں اپنی ناداری کی تصویر لیے جو پھیر رہی ہے وہ کردار ہے ''سکینہ '' کا جنس ایک جبلت ہے یہ کوئی حیوانی جذبہ نہیں کہ صرف جانوروں تک محدود رہے یہ ایک خوشگوار احساس کا نام ہے اگر فطرت کے اصولوں کے عین ممکن بنایا جائے جنس ایک ضروری عمل ہے یہ ذہنی اور جسمانی بھوک کی طرح ہے یہ مہذب معاشروں میں بطور آکسیجن کا کام کرتی ہے۔ فرائیڈ جیسے ماہر نفسیات دان نے اس تجربے کو انسانی خواہشات کا نام دیا ہے۔ معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لئے یہ جنس اور جنسی خواہش صرف مرد ذات سے منسوب کرنا اور

عورت کے لئے تیسرے درجے کی چیز یا عمل قرار دینا دراصل عورت کو سماجی رتبہ نہ دینے کے برابر ہے مرد اور عورت دراصل انسان کے دو رخ ہیں۔ دونوں کے احساسات و جذبات سے مل کر انسان بنتا ہے اس طرح ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرہ تضادات کا شکار تب ہوتا ہے جب کسی فعل یا عمل کو ایک پہلو سے دیکھنا یا سمجھنا شروع ہو جاتا ہے۔ ناول کا کردار اعجاز یا میجر فراز، سکینہ یا نسرین اور کنیز دراصل معاشرتی رویوں میں ایک جنسی ناہمواری کا شکار نظر آتے ہیں۔ ناول میں ان غیر انسانی رویوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

ناول "نادار لوگ" میں نسوانی کرداروں کے مختلف سماجی روپ کی عکاسی کی گئی ہے۔ سکینہ ماں، بیٹی اور بیوی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ماں ہونے کے ناطے اُسے اپنے خاندان کی فکر رہتی ہے۔ ممتا کا یہ احساس صرف اور صرف اُس کی اولاد تک محدود نہیں بلکہ وہ اپنے چھوٹے دیور سرفراز کی پرورش بھی اپنے بچوں کی طرح کرتی ہے۔ سکینہ چاچا احمد کی بیٹی ہے لیکن بیاہ کے بعد وہ اعجاز کے ساتھ مکمل طور پر منسلک ہو جاتی ہے۔ سکینہ ایک وفا شعار بیوی کی طرح اعجاز کے گھرانے کو سنبھالتی ہے اور ناول کے آخر تک اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے غفلت نہیں برتتی۔ نسرین کا کردار بھی بیٹی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے یعنی وہ غریب مزارعے کی بیٹی ہے لیکن اپنی مجبوری کی وجہ سے متعدد لوگوں کی جنسی ہوس کا شکار ہے۔ نسیمہ اول میں بیٹی اور بعد ازاں سرفراز کی منگیتر بن جاتی ہے۔ جبکہ کنیز کا کردار معاشرے میں اپنی سماجی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے سرگرداں نظر آتا ہے۔ معاشرہ ایک سے زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے جب یہ مخالف جنس کو انسان نہیں سمجھتی تو اس کا ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مغرب ہو یا مشرق جو اب بیٹی کی جوانی درندوں کے معاشرے میں عدم تحفظ کا شکار رہی ہے۔

ناول " نادار لوگ" کے نسوانی کرداروں پر نظر ڈالی جائے تو سکینہ اور نسیمہ کی عزت محفوظ ہاتھوں میں ہے جبکہ کنیز اور نسرین حالات کے بے رحم تھپیڑوں کی زد میں ہیں۔ کنیز اور نسرین کے کردار کو پڑھتے ہوئے تو ایسے لگتا ہے کہ یہ بالکل ہمارے معاشرے میں چلتے پھرتے کردار ہیں۔ ناول " نادار لوگ" کو پڑھتے محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے ناول میں جن موضوعات کو اپنا موضوع بنایا وہ آج بھی ہمارے ارد گرد کسی نہ کسی صورت یا شکل میں موجود ہیں۔ کنیز، نسرین، اعجاز، میجر سرفراز دراصل مختلف اجتماعی نظریات یا طبقات کی طرف اشارہ ہے۔ آج کا جدید انسان غار کے دور سے لے کر موجودہ تک دور تک اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ چاند پر پہنچ کر بھی انسان اپنے موجود سے مطمین نہیں لیکن عورت کی ذات کو لے کر وہی پرانے فرسودہ نظریات کا شکار یا قیدی نظر آتا ہے لڑکی تو دوسرے کی امانت ہے۔ لڑکی کی پیدائش کے دن سے لے کر آخری شادی تک بیٹی یا بہن کو بطور مہمان سمجھنا۔ دراصل یہ تصور معاشرے کے ایک بڑے گروہ میں موجود ہے اس قسم کے تصورات سے

لڑکی پر کیا گزرتی ہے؟ اس کے کردار میں خود اعتمادی کی کمی کا فقدان گھر سے پروان چڑھنا شروع ہو جاتا ہے کبھی اس پہلو سے سوچا گیا ہے؟ نہیں یہ تو فحاشی کی طرف بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ دراصل ان تصورات اور نظریات کی وجہ معاشرہ عدم توازن اور تضادات کا شکار ہے۔ "نادار لوگ" میں کنیز کس کی خاطر جنسی درندوں کا شکار ہے؟ استحصال کرنے والوں کو احساس تک نہیں؟ دوسری طرف جذباتی بلیک میلنگ، بیوی، ماں، بہو اور بھابھی کی صورت میں استحصال کا شکار ہے۔ اس طرح ناول نگار نے ہمارے سامنے ہمارے معاشرے میں عورت کا سماجی رتبہ اور حیثیت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ادیب معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے یہ علامت کنایوں اور اشاروں میں کرداروں کے ذریعے پورے عہد کی اجتماعی تصویر دکھاتے ہیں اس طرح کے تاثرات کے لیے " نادار لوگ" ایک بہترین نمونہ ہے۔

"نادار لوگ" کے نسوانی کرداروں میں فطری پن اپنے ماحول کے مطابق پایا جاتا ہے۔ سکینہ اعجاز کی بیوی ہوتے ہوئے گھر کے کاموں میں جٹی نظر آتی ہے۔ کنیز اپنے جسمانی استحصال سے چھٹکارا پانے کے لیے فرار ہونے کی کامیاب کوشش کرتی ہے تاکہ وہ معاشرے میں عزت سے زندگی گزار سکے۔ نسرین کا کردار ایسا ہے کہ وہ فطری طور پر داشتہ نہیں مگر حالات کی ستم ظریفی نے اُسے بے حس بنا دیا ہے۔ " نادار لوگ" کے نسائی کرداروں میں کنیز کا کردار ارتقاپذیر ہے۔ اُسے اس بات کا شدید قلق ہے کہ اُسے بار بار جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس نفسیاتی بیماری سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ مسلسل کوشش کرتی ہے کہ اس گھٹن زدہ ماحول سے بھاگ جائے۔ ناول نگار نے نسرین کے مکالموں سے بھی یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُس کی زندگی حالات کے رحم و کرم پر ہے۔ نسیمہ ابتداء میں سرفراز کی شخصیت میں واضح دلچسپی رکھتی ہے مگر بعد میں سرفراز کی رفاقت میں مبہم سی اُلجھن کا شکار نظر آتی ہے۔ ناول میں نسائی کردار باقاعدہ کسی تانیثی نظریات نفسیاتی اور مارکسی نظریات کے پختہ عکاسی نہیں لیکن یہ نسائی کرداروں کا ہمارے معاشرے سے سوال ہے کہ معاشرے میں عورت کا مقام و رتبہ کیا ہے؟ یہ نسائی کردار ہمارے اردگرد معاشرے میں بطور انسان رہنے کا مطالبہ ہے۔

صنف کی بنیاد پر فن پارے یا کرداروں کو تقسیم کرنا یا الگ کرنا احساس کمتری اور احساس برتری کے زمرے میں آتا ہے لیکن جب صنفی امتیاز پر ادب یا فن پارے کو پرکھنا یا پڑھنا تو صرف نسائی کردار و یا نسائی ادب مفہوم لینا یہ ایک طرح سے شدت جذبات اور احساس برتری کا احساس ہے۔ عورتوں کے بارے میں رائج تصورات و نظریات میں اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنا ناجوان پڑھے لکھی نسل پر لازم ہے ورنہ اس کے نتائج سنگین خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ دور حاضر میں عورت آگاہی اور حقوق نسواں سے آگے کا مرحلہ چل رہا ہے

عورت کو اپنے اوپر مسلط ذمہ داریاں اور خود ساختہ فرسودہ روایات سے تنگ آکر عملی احتجاج کا موقع مل گیا ہے اب ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ وہ جاہلیت کا زمانہ نہیں کہ جہاں عورتوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا۔ اب تو جدید تقاضوں اور رجحانات کے تناظر میں عورت تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ مذہب، سائنس اور معاشرے میں باقاعدہ انسان ہونے کا مطالبہ کر رہی ہے تو ایسے میں عورت یا مرد جیسی سوچ رکھنا اندھیرے میں رہ کر دوسروں کو اندھیرے میں سمجھنے والی بات بنتی ہے۔ ناول یا افسانہ جو کہ کرداروں اور واقعات پر مشتمل ہوتا ہے تو ایسے میں کرداروں کی نفسیات اور ترجحات واضح کرنا مصنف کا فریضہ سمجھا جاتا ہے۔

'' نادار لوگ'' میں ناول نگار نے عورت کے مختلف روپ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ قاری پر ہر کردار پڑھتے ہوئے معاشرے میں اس کا سماجی و سیاسی رتبہ و مقام سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح ایک کردار سکینہ ہے جو کہ قاری پر عیاں کرتا ہے کہ ایک تابعدار بیٹی، اطاعت شعار بیوی کا عملی مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔ سکینہ کا شوہر بلکہ مجازی خدا گھر سے باہر کے کاموں میں سرگرم دکھایا گیا ہے۔ جب کہ اپنی بیوی کے حقوق سے باغی اس طرح سکینہ گھر میں ایک کفایت شعار بیوی، ماں اور بہو کی صورت میں نظر آتی ہے۔ یہ کردار دراصل ہمارے قبائل یا پاکستانی معاشرے میں ایک ذمہ دار عورت کی طرف اشارہ ہے کہ کس طرح اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں بچوں اور اپنے خاندان کی خدمت کرتی اور مجازی خدا اس بے چاری کی محبت اور جذبے کو صرف جسمانی بھوک کے مٹانے کے قابل بھی نہیں سمجھتا؟ یہ عورت اگر کبھی کسی مرد کے ساتھ نظر آتی ہے تو اس غیرت مند مجازی خدا کا وہ لمحہ غرور دیکھنے والا ہوتا ہے کہ عورت کی ذات پر کیچڑ اور غیرت کے نام پر قتل وغیرہ۔۔۔ اس طرح ناول نگار نے سکینہ کردار کے ذریعے پاکستانی معاشرے کی ایک گھریلو عورت کی تصویر دکھائی ہے۔ یہ کردار ایک مظلوم کردار ہے۔ اس کا شوہر باہر کسی دوسری عورت کے ساتھ تعلق رکھ کر گھر سے فراریت اختیار کرتا ہے یہ المیہ موجودہ دور کے مردوں کا المیہ ہے۔ برے دنوں میں مجازی خدا کا ساتھ دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سکینہ کا کردار بیک وقت میں شوہر کے لئے محبت والا اور گھر کی بقا اور ترقی میں خوش رہنے والا دکھایا ہے۔ سکینہ ایک انسان ہے اعجاز جب کنیز سے ہو کر گھر آتا ہے تو سکینہ سوچتی ہے کہ کتنے عرصے سے میں اعجاز کے ساتھ ہمبستری نہیں کر سکی ہوں یہاں پر ایک عورت کی شکایت ایک مجازی خدا سے سامنے آتی ہے۔

سکینہ کا کردار عبداللہ حسین نے گھریلو تقاضوں کے تحت تخلیق کیا ہے جس میں مشرقی عادات و اطوار کوٹ کوٹ کر بھرے گئے ہیں۔ دیہاتی ماحول میں زندگی گزارنے والی سکینہ کو اپنے شوہر اور کنبے سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں، پورے ناول میں اُس کا کردار مثبت پیمانوں پر اُستوار رہتا ہے۔ سکینہ آڑے وقت میں بار بار اعجاز

سے تقاضا کرتی ہے کہ جائیداد اُس کے نام کر دی جائے کیونکہ ایک طرف تو اُسے حقِ ملکیت کا احساس ہے تو دوسری طرف اُسے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں اعجاز اپنا سب کچھ کسی مصّلن کی جھولی میں نہ ڈال دے۔ سکینہ کے کردار میں سادگی کی رنگ امیزی بھی پائی جاتی ہے کیونکہ جب شہر سے نسیمہ اور شعیب اُن کے گھر آتے ہیں تو اِن کے سامنے سکینہ کی دیہاتی جھجک اپنی تمام معصومیت کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس بھولپن کے ساتھ ساتھ سکینہ کا کردار خود اعتماد جذبوں کا ضامن ہے، سکینہ جو کچھ بھی کرتی ہے اپنے گھرانے کے بھلے کے لیے کرتی ہے۔ سکینہ کے کردار میں ذاتی اغراض و مقاصد کا مادہ ناپید ہے۔

" نادار لوگ" کا دوسرا اہم نسائی کردار کنیز ہے۔ یہ کردار اپنا ارتقائی سفر جاری رکھتا ہے اس کردار سے قاری کا تعارف ایک حادثے کی صورت میں ہوتا ہے کہ ایک کردار سب کے سامنے اپنی بے بسی کا رونا روتا ہے۔ لوگوں سے مدد کے لئے اپیل کرتا ہے ظالم لوگوں سے اپنے لئے زندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ انتہائی غیر یقینی اور بے بسی کی تصویر لے کر یہ کردار قاری پر عیاں ہوتا ہے لیکن اعجاز کی طرح درندہ صفت انسان اس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اس کو اپنی حوس کا نشانہ بناتا ہے۔ یہ نسائی کردار جوانی سے بھرپور کردار ہے۔ اس پر حواس زدہ مرد کی نظر ایسی بیٹھتی ہے جس طرح گندی مکھی گند پر بیٹھتی ہے۔ کردار کنیز کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک جاندار کردار ہے اور حالت جبر کا شکار ہے۔

اُردو ناول میں ایسے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں جو کہ حالات کے جبر کا شکار ہو کر معاشرے میں درندوں کی زد میں آتے ہیں امرو جان ادا کا کردار گھر سے طوائف نہیں ہوتا بلکہ ظالم سماج اور مجبوری کے سبب یہ کردار طوائف اور رنڈی بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ناول " نادار لوگ" میں کردار کنیز بھی جبر کا شکار ہو کر اعجاز کی گرفت میں آتا ہے۔ یہ کردار اپنی خوشی اور پسند سے اعجاز سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اپنے پیاروں اور دو وقت کی روٹی کے لئے اعجاز کی حوس کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے یہ کردار اپنی مرضی اور جنسی تسکین کے لئے اعجاز کا ساتھ نہیں دیتا یہ تو ایک سلسلہ وروز شب کا نظام چلانے کے لئے یہ سب کچھ کرتا ہے۔ دوسری طرف اعجاز جو کہ مردانہ سوچ کا نمائندہ ہے گھر میں خوبصورت اور تابعدار بیوی کے باوجود کنیز سے لطف اندوزی لینے لگتا ہے تو یہاں پر دو مختلف قسم کے سوچ رکھنے والے معاشرتی کردار سامنے آتے ہیں۔ اعجاز اپنے اوپر کئے گئے ظلم کا بڑا اس کنیز کے ساتھ جنسی عمل کر کے تھکاوٹ اتراتا ہے جبکہ کنیز اپنی تقدیر کا لکھا ہوا سمجھ کر برداشت کرتی ہے۔ کنیز کے کردار کا یہ تعلق پہلا تعلق نہیں ہوتا اس طرح مردانہ حوس کا شکار وہ پہلے بھی ہوئی ہے اس طرح کنیز کا کردار اپنا ارتقائی سفر جاری رکھنے کے لیے دیہات سے چل کر شہر کی طرف آجاتا ہے۔ جہاں اعجاز کا دوست بشیر بھی اس کو حوس اور جنسی تسکین کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ کردار کنیز دراصل دیہات اور شہر میں عورت کی ذات اور عدم تحفظ کو لے کر سوالات

اُٹھارہا ہے کہ ہمارا معاشرہ جو کہ نیم جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ اصولوں پر مشتمل ہے کس قدر گھٹن اور سماجی و جنسی گھٹن کا شکار ہے کس طرح بے بس لاچار عورتوں کو بھٹہ میں کام کرنے والے عورت مزدور کو استعمال کیا جاتا ہے؟ کس طرح شہروں میں عورت کو ریسپشن سیٹ پر بیٹھا کر دفتر کی زینت بنایا جاتا ہے؟

کس قدر اذیت کا شکار ہو کر عورت معاشرے سے مایوسی کا شکار ہوتی ہے۔ عورت کی معاشی آزادی نہ ہونے کے سبب کس قدر غیر یقینی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان تمام سوالات کی بھرپور عکاسی کنیز کردار کو پڑھ کر ہوتی ہے ناول نگار نے شہر میں کنیز کو اعجاز کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے دکھایا ہے جس کے دوران کنیز کردار اپنا ارتقائی سفر اور اپنے اوپر ظلم و جسمانی تشدد کو بیان کرتی ہے کہ کس قدر مجھ جیسی بھٹہ مزدور عورت کو مسائل کا سامنا رہا ہے۔ یہ کردار پارٹی قیادت میں اپنے لیے اور آنے والی بھٹہ مزدوروں کے لئے مزید قربانیاں دینا چاہتی ہے تاکہ میری طرح کوئی اور عورت بھٹہ مزدور ان درندوں کے حوس کا نشانہ نہ بنے۔ ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے معاشرتی ناہمواری کا تلخ حقیقیت نگاری کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ یہ کنیز " نادار لوگ" کا عملی مظاہرہ ہے۔

ناول کا ایک نسائی کردار نسیمہ ہے بظاہر یہ مختصر سے وقت کے لیے سامنے آتا ہے لیکن یہ کردار دراصل اعلیٰ طبقے میں عورت سوچ کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے یہ کردار شعیب کی بہن اور میجر سرفراز کی منگیتر کی صورت میں دکھایا جاتا ہے یہ کردار دراصل شہر میں رہنے والی پڑھی لکھی مالدار گھرانے کا کردار ہے یہ میجر سرفراز کے ساتھ گاوں جانے کی حامی بھرتا ہے تو سرفراز حیران ہو کر رہ جاتا ہے کہ کس طرح دیہات کے گھر میں اس کو لے کر جاؤ نگا؟ کیا سوچتی ہو گی میرے اور میرے گھر کے بارے میں؟ اس طرح سرفراز اعجاز سے گھر کی صفائی اور دیگر لوازمات سے سے آگاہ کرتا ہے سرفراز کی پسند کی منگنی سمجھی جائے یا معاشی معاہدہ لیکن یہ کردار شہر اور دیہات کے ماحول کی عکاسی قاری پر عیاں کرتا ہے۔ یہ کردار ضمنی ہی سہی لیکن اس ناول میں بیک وقت شہر اور دیہات کی عکاسی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اس طرح پاکستانی معاشرے میں مختلف طبقات کے تصورات قاری پر عیاں ہوتے ہیں۔

نسیمہ اور سرفراز ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھتے ہیں۔ سرفراز جمالیاتی سطح پر نسیمہ کو پرکھتا ہے اس طرح عورت کی نفسیات ناول نگار دکھانا چاہتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کے بعد بھی مرد کی نظر کو کس قدر محسوس کرتی ہے یہاں پر مردانہ سوچ کے حامل ذہنیت سامنے آتی ہے کہ نسیمہ سرفراز کی خوشی کے لئے اس کے گاؤں جاتی ہے اور سرفراز کی محبت میں قید نظر آتی ہے۔ ناول میں اس کے تاثرات کثرت سے بیان ہوئے ہیں۔

نسائی کردار نسرین ناول کے آغاز میں سرفراز کے ساتھ دکھایا جاتا ہے جس میں قاری پر عیاں ہوتا ہے نسرین اور میجر سرفراز کے مابین ایک رومانوی قسم کی محبت ہے جو کہ دونوں میں جذبہ محبت کو تازہ کرتی ہے۔

سرفراز نسرین کو یاد کرتا ہے اور نسرین سرفراز کو تنگ کرتی نظر آتی ہے یہ نسائی کردار نسرین بچپن سے تضادات اور مسائل کا شکار ہے بوڑھے کرنل کے گھر رہتا ہے۔ کرنل کی بیوی وفات پا چکی ہے بچے امریکہ میں ہوتے ہیں۔ سرفراز کرنل کے گھر آتا جاتا ہے۔ سرفراز نسرین کے ساتھ جنسی تعلق استوار کرتا نظر آتا ہے لیکن نسرین کوئی مزاحمت نہیں کرتی تو ایسے میں میجر سرفراز جو کہ ایک مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے ٹھیک طرح دیہاتی تجربہ رکھتا ہے تو نسرین کی طرف سے مزاحمت نہ کرنے پر محسوس کرتا ہے۔ لیکن جنسی تسکین کے لیے نسرین کو رد نہیں کرتا۔

یہ نسرین کردار بچپن سے جنسی تشدد کا شکار آرہا ہے۔ بوڑھا کرنل اس کے ساتھ یہی عمل جاری رکھتا ہے بلکہ اسی ایک عمل کے لئے گھر رکھا ہوتا ہے کھانے پینے اور پہنے کو سب کچھ دیتا ہے لیکن بوڑھا کرنل راتوں کو اس جوان جسم کے مزے لیتا ہے تو ایسے میں میجر سرفراز بھی اس پر ٹھرک مارتا ہے۔ سرفراز کے سامنے شعیب کے دفتر میں ایک دفعہ کچھ تھوڑی بہت مزاحمت کرنے پر میجر سرفراز منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتا ہے تو نسائی کردار ظلم وجسمانی تشدد سے تنگ آکر سرفراز کو کہتا ہے کہ بوڑھے کرنل سے لے کر تمہارے تک سب نے میرے جسم کو دیکھا ہے لطف اُٹھایا ہے کبھی یہ تک نہیں سوچا ہے کہ میرا کیا بنے گا؟ اس قسم کے سوالات کا براہ راست طنز ہمارے پڑھے لکھے روشن خیال طبقے پر ہوتا ہے کہ کس طرح غریب لاچار لڑکیوں کو اپنی عیاشیوں کا شکار بنایا جاتا ہے کس طرح بے رحمی اور غیر انسانی رویوں سے عورت کو صرف جنسی تسکین کے لیے استعمال کر کے معاشرے میں ناکارہ پیش کیا جاتا ہے؟ کس طرح اپنی بیٹی کے عمر کی لڑکی کو اپنی باہوں میں لے کر عیش کیا جاتا ہے یہ معاشرتی طنز ناول نگار نے نسرین کے کے کردار کے ذریعے کیا ہے۔ ناول نگار نے اس نسرین کے ذریعے موجودہ عہد کے مختلف طبقات کی تصویر دکھائی ہے۔ نسرین کے مسائل دراصل معاشرے میں ایک عام عورت کے مسائل ہیں۔ آج امیروں کے گھر میں کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟

جوان بچیوں کو امیروں کے گھروں میں صفائی کے لئے بھیجا جاتا ہے وہاں لوگ کس طرح پیش آتے ہوں گے؟ ادیب لوگ مسائل اور مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ زندگی ممکنات کا مجموعہ ہے ادب میں دوسروں کے تجربات بیان کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کا رفرما ہونا ممکن ہے۔ نسرین کردار درندوں کے معاشرے میں ایک بے بس کردار ہے جو کہ اپنے اوپر ہونے والی جنسی تشدد کو بیان نہیں کر سکتا بس ایک بے بسی اور ناداری کا عکس پیش کرتی نظر آتی ہے۔

" نادار لوگ" کا ایک اہم نسائی کردار یہ ایک علامت ہے کہ کس طرح عورت ذات کو استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ عورت ذات کسی بھی طبقے میں ہو وہ اپنی عزت اور جسم کو لے کر پریشان رہتی ہے۔ بوڑھے کرنل جیسے بے حس لوگ اس عورت کو اپنی مرتی جوانی کے بعد استعمال میں نہیں لاتے ہیں۔ دوسری طرف دیہاتی سوچ کے مالک سرفراز عورت کو صرف جسم کی حد تک رکھتے ہیں۔ ناول میں اس کی عکاسی ہوتی ہے۔

نسرین " نادار لوگ "کا چوتھا نسوانی کردار ہے۔ناول میں نسرین، سرفراز کی محبوبہ اور بوڑھے کرنل کی داشتہ کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔اس کردار سے ہماری ملاقات ایسی ہوتی ہے کہ سرفراز ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے مسلسل نسرین کے متعلق سوچ رہا ہے۔ سرفراز کو نسرین کی رفاقت میں یہ میٹھے لمحے شدت سے یاد آتے ہیں کہ:

"تمہیں اتنی دور سے آنے کے لئے چھٹی کیسے مل جاتی ہے؟"

"ہمارے ہاتھ کا کمال ہے۔"

"میری خاطر آتے ہو؟"

"ہاں۔"

"جب میں نے پہلے روز دیکھا تھا تو سمجھی تھی تم بیوقوف فوجی ہو۔"

"ہم نے تمہاری جان بچائی تھی اس لئے؟"

"میں نے لفٹ کے لئے پوچھا تو تم خواہ مخواہ اُتر کر باہر کھڑے ہو گئے تھے۔"

"لفٹ دینے سے پہلے تمہارا جائزہ نہ لیتا؟تمہارے جیسے دہشت گرد دنیا میں تھوڑے ہیں؟"

"میں نے کہا تھا'میرا نام نسرین ہے تو اپنا تعارف کرانے کی بجائے گنواروں کی طرح میرا مُنہ دیکھتے رہے تھے۔"

"نام بتانے کا ہوش کیسے تھا، میں تو تمہارا مُنہ چومنا چاہتا تھا۔" (۵)

سرفراز نسرین کی طرف بڑھتا جارہا ہے اس کی محبت میں گرفتار ہو کر سوچنے کا محور نسرین ہوتا ہے۔ بہانے بہانے سے نسرین کی طرف جاتا ہے جبکہ نسرین سرفراز کے لئے دل میں نرم جگہ رکھتی ہے۔ یہ نسرین وہ کردار ہے جو بوڑھے کرنل کے گھر میں بوڑھے کی جنسی تسکین کا آلہ ہے۔ بوڑھا کرنل اس کو بطور جنسی مشین کے طور پر ستعمال کرتا ہے۔ سرفراز بھی اس طرح نسرین کو جسمانی طور پر لذت کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے جبکہ منگنی کا ارادہ نسیمہ سے ہے۔ اب ایک دفعہ نسرین سرفراز کے سامنے مزاحمت کرتی ہے تو سرفراز منہ پر تھپڑ رسید کرتا ہے اس کے جواب میں نسرین مردانہ سماج کو گالی دیتی ہے۔

"مجھے سب نے استعمال کیا ہے بوڑھے کرنل سے لے کر جوان افسروں تک۔ تم ایک اور طمانچہ لگادو میں تو اس کی عادی ہوں۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے لو۔ مارو۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی۔" (۶)

نسرین کا یہ انداز دراصل ہمارے معاشرے میں مختلف طبقات پر طنز ہے کہ پاکستان جو کہ بیک وقت میں سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کا مجموعہ ہے اس نظام حیات میں عورت کو نظریہ اشتہار یا نظریہ ضرورت بستر

کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارے سماجی رویوں میں عورت کی عزت ناپید ہو رہی ہے تو ایسے میں اسے اس طرح کے المیے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نسرین کا کردار دراصل ایک علامت ہے استحصال شدہ عورت کا کہ شہر کی روشنیوں میں صاف کپڑے پہن کر عورت گھر سے نکلتی ہے لیکن کس قدر عدم تحفظ کا شکار ہے؟ نسرین کی عورتیں ہمارے معروض میں جنسی درندوں کا شکار ہوں گی؟ ادیب ممکنات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ادیب سخت حقیقت نگار ہوتے ہیں۔ نسرین کو بطور جنسی آلہ کے طور پر دکھایا گیا ہے کہ حسبِ توفیق ہر شخص نے اس کو اپنی حوس کا نشانہ بنایا ہے۔ ان جنسی درندوں کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ انسانی بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکا۔ آئے روز اخباروں میں جنسی تضادات اور اس سے بڑھتے ہوئے واقعات انسانی معاشرے کا بڑھتا ہوا اجتماعی رویہ ہے۔ عبداللہ حسین نے تلخ سماجی ناہمواریوں کو "نادار لوگ" کا موضوع بنایا ہے۔ نسرین جیسے کرداروں کو "نادار لوگ" کا موضوع بنایا ہے۔ نسرین جیسے کرداروں سے "نادار لوگ" بنا ہے۔

ب: ""نادار لوگ" کے کرداروں کا نسائی رد تشکیل کے تناظر میں عموی مطالعہ

اپنے عنوان کی طرح ناول کے کردار عمومی طور پر ناداری کا شکار نظر آتے ہیں عبد اللہ حسین کے ناولوں کے عنوانات قاری پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ " نادار لوگ"، "اداس نسلیں"، "قید "، "بھاگھ "، وغیرہ دراصل یہ اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں اپنے معرض میں ہونے والے حالات واقعات سے بننے اور بگڑے والے سماج کی تصویر قاری کے سامنے آتی ہے۔ ناول کے کردار ایک سوچ، نظریے کے تحت پروان چڑھتے ہیں۔ مرادانہ ذہنیت یہاں پر حاوی نظر آتی ہے۔ جس طرح عبداللہ حسین کے " نادار لوگ" کا ہر کردار ظلم و تشدد کا شکار ہو کر نادار ہو کر رہ گیا ہے۔ اس طرح ناول کے نسائی کردار قاری کو ظلم کی چکی میں پستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ ہمارے معاشرے کی تلخ عکاسی ہے جو کہ ناول نگار نے کی ہے۔

عبد اللہ حسین کے نسائی کردار مرادانہ سماج میں مردوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہیں، کبھی کنیز، کی صورت میں، کبھی نسرین کی صورت کبھی سکینہ کی بیوی کی صورت میں۔ یہ نسائی کردار ایک جاگیر دارانہ سماج کی پیداوار ہیں۔ مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہاں پر مردوں کا رویہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح مردانہ سوچ کے حامل لوگ عورت کی مظلومیت کا فائندہ اُٹھا کر ان کو استعمال کرتے ہیں۔

اعجاز کنیز کی مجبوری کا غلط فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات بناتا ہے یہاں پر حوس کا مارا ہوا ذہن قاری پر عیاں ہوتا ہے کہ مردانہ سوچ کی نفسیات کس طرح سوچتی ہے دراصل یہ تصویر ہمیں اجتماعی معاشرے میں مردانہ سوچ کی نمائندگی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس طرح یہ کنیز کوئی مردانہ کردار مطلب اعجاز کا دوست اس کو شہر لے جا کر غلط طرح استعمال کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کنیز بھٹہ سے لے کر شہر کی رونقوں میں بھی محفوظ نہیں۔ مردانہ ذہنیت اس کی جوانی کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتا آرہا ہے۔ یہ تمام طرح

کے حالات واقعات عورت کے سماجی رتبے نہ ہونے کے نوحے ہیں۔ مصنف قاری کو بتانا چاہتا ہے کہ ہم نے معاشرے میں عورت کو کہاں رکھا ہے؟ گھر کی زینت بنا دیا ہے؟ گھر سے باہر تو نمائش کے طور پر عورت کی معاشی آزادی کو مرد کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ مردانہ ذہنیت مختلف طریقوں سے عورت کا استحصال کرتی ہے۔ یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ سرفراز کی مردانہ ذہینت اور نسرین کا نسوانی رویہ قاری پر ایک نیا منظر عیاں کرتا ہے۔ یہاں پر مصنف مختلف طبقات کی تصویر دکھانا چاہتا ہے کہ عورت کی جو بھی کلاس کیوں نہ ہوں مردانہ سوچ کے استحصال کا کس طرح نشانہ بنتی ہے سرفراز کا نظریہ کسی عام جاہل جاگیر دار اور کسان سے کم نہیں۔ نسرین کو اپنے سامنے صرف جنس تک محدود رکھتا ہے۔ جب نسرین مزاحمت کرتی ہے تو یہ سرفراز نسرین کے منہ پر تھپڑ رسید کرتا ہے۔ یہاں پر مردانہ سوچ کی عکاسی ہوتی ہے کہ کمزور جاہل انسان عورت پر ہاتھ اُٹھاتا ہے اس طرح عورت کی آواز دب جاتی ہے یہ ایک جاہلانہ عمل ہے جو کہ دیہاتوں اور جابر مردانہ سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

اس طرح قاری کو " نادار لوگ " کے مردانہ کرداروں کی طرح نسوانی کردار بے بسی کا شکار نظر آتے ہیں۔ لیکن ناول کے دیگر کردار سماجی برائیوں اور ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ ناول میں نسائی کرداروں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والے اور بنانے والے دونوں مظلوم ایک دوسرے پر غصہ نکالتے نظر آتے ہیں۔ مردانہ کردار گھر سے باہر مظلوم، کسان دوسروں کے زد میں ہیں۔ استحصال ہو رہا ہے۔ کسی جاگیر دار اور سرمایہ دار کے سامنے بے بسی کی تصویر بنے ہیں۔ لیکن گھر کی چار دیواری میں شیر بنتے ہیں۔ اپنی عورتوں کو بچے پیدا کرنے والی آلہ سمجھتے ہیں۔ صرف بستر کی زینت بناتے ہیں راتوں رات دن بھر کی تھکاوٹ اور غصہ نکال کر اپنی مردانگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ گھر سے باہر مظلوم بے بس لڑکی یا عورت ذات کو دیکھ اپنی حیوانیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

یہی رویہ " نادار لوگ " کے کرداروں کو درپیش ہے۔ یہاں ایسا نہیں کہ عورت مزاحمت نہیں کرتی۔ نسرین کنیز اور سکینہ باقاعدہ مردانہ سوچ کو سب کے سامنے لانے کی مختلف کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ عورت کا معاشرے میں رتبہ کیا ہے؟ آج سماج کو یہ بتاتے بتاتے انسان خوار ہو جاتا ہے۔ عورت کو حقوق الہامی کتب میں موجود ہیں۔ آئین میں موجود ہیں لیکن معاشرتی حیوانوں نے اس کے الٹ قدم چلائے ہیں۔ عورت گو زمین کا ٹکڑا سمجھ کر بچے پیدا کرنے اور مرد کے پاؤں کی جوتی سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ اس طرح حقوق نسواں کی تحریکیں اور مختلف پلیٹ فارم پر عورت کے حقوق کی باقاعدہ تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ کبھی غیرت کے نام پر قتل، کبھی عورت کے منہ پر تیزاب پھینکا گیا ہے۔

لیکن قاری کو عبد اللہ حسین کے ناولوں میں مردانہ سوچ کی زد میں آنے والی نسائی کرداروں کی چیخ سنائی دیتی ہے ایک پرزور مطالبہ کہ عورت کو بچے پیدا کرنے والی مشین نہ سمجھا جائے۔ بستر کی زینت نہ سمجھا جائے۔ بطور انسان اس کے ساتھ سلوک کیا جائے اس طرح معاشرتی ناہمواریوں میں یہ سب سے بڑی ناہمواری ہے اس کی طرف " نادار لوگ "میں عکاسی کی گئی ہے۔

عبد اللہ حسین کے ناولوں میں اپنے عہد کی عصری تاریخ اور اجتماعی مسائل کی بھرپور نمائندگی نظر آتی ہے۔ " نادار لوگ" ایک بڑا ناول ہے اس میں ایک سے زیادہ موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ناول میں صرف رومانوی کہانیاں نہیں بلکہ اپنے عہد کی سیاسی و سماجی اور سماجی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے رویے بھی زیر بحث آتے ہیں۔ ناول کی فضا تخیل پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس ناول کی صنف میں اپنے عہد کی اور ایک سے زیادہ سچائیاں ہوتی ہیں ڈی، ایچ لاؤنس نے ناول کو زندگی کی کتاب قرار دیا تھا۔ تو" نادار لوگ" دراصل کرداروں کا وہ نوحہ یا داستان ہے جو کہ ہر کردار روتا نظر آتا ہے یہاں تک کہ قاری پڑھتے سماجی ناہمواریوں کو اپنے ارد گرد محسوس کرتا ہے۔ ناول کے مردانہ کردار اور زنانہ کردار ایک المیے کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ واقعات و حادثات کے زد میں آنے والے کردار ناداری اور بے بسی کی تصویر کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اس میں مردانہ کردار جبر اور سماجی ناہمواریوں کا شکار ہیں تو دوسری طرف نسائی کردار ہمیں ان پسماندہ اور بے بس مردانہ کردار کی وجہ نسائی کردار حالت جبر کا شکار نظر آتے ہیں۔ سکینہ، نسرین، کنیز، نسیمہ اور دیگر نسائی کردار جو کہ جسمانی و روحانی تشدد کا شکار ہیں اس طرح میجر سرفراز، اعجاز، بشیر اور دیگر مردانہ کردار معاشرتی جبر کا شکار نظر آتے ہیں۔

زندگی کی بے معنویت اور حالت جبر کے شکار کے اثرات کو محسوس کرنا ہوں تو عبد اللہ حسین کی تحریروں کو پڑھا جائے۔ ناول نگار نے اپنے عہد کے سماج میں ناہمواریوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ ناول کے نسائی کردار ایک ناختم ہونے والے المیے کے ساتھ سانس لیتے نظر آتے ہیں سکینہ ایک حساس کفایت شعار بیوی اور ماں کے طور پر دکھائی گئی ہے۔ مرد ذات کو گھریلو فرائض سے باغی کردار دکھایا گیا ہے۔ عورت کو صرف بستر کی زینت اور بچوں کی تربیت اور بچوں کی پیدائش کی مشین تک محدود رکھنا اعجاز مردانہ سوچ کی عکاسی قرار دیا گیا ہے۔ اعجاز کردار جو کہ اپنی ناہمواری اور جنسی تسکین کے لئے سکینہ اور کنیز کا استعمال کرتا ہے دراصل یہ جنسی خواہش کی تکمیل میں ایک زبردست جنسی خواہش کا عملی مظاہرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

میجر سرفراز جو کہ ایک دیہاتی پس منظر رکھتا ہے لیکن عہدہ اور بڑے لوگوں کے ساتھ رہنا بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ اس کے سامنے عورت ایک جسم ہے۔ جب جہاں چاہا استعمال کیا۔ اس کی وضاحت نسرین کے ساتھ تعلق سے واضح ہوتی ہے۔ نسرین کی تھوڑی سی مزاحمت قبول / یا برداشت نہیں کرتا۔ دراصل جنسی خواہش کو صرف مرد ذات تک محدود رکھنا ایک جاہلیت کی انتہا ہے۔ یہ فطری جذبہ ہے خوشگوار احساس ہے یہ دو انسانوں کی طرف سے ایک فطری مطالبہ ہے جو کہ یکطرفہ نہیں ہوتا۔ یک طرفہ ہونے پر درندگی کا عمل ٹھہر جاتا ہے۔ باہمی

رضامندی اور انسانی جبلت سمجھ کر تعلق استوار رکھنا کوئی برا فعل نہیں۔ ہمارے ارد گرد عورت کے بارے میں جو تصورات و نظریات رائج ہے اس میں عورت کو صرف جنسی فعل اور گھر کی چار دیواری تک رکھنا ایک گمراہ کن سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ معاشرہ عورت اور مرد کے ملاپ سے بنتا ہے اس میں دونوں کو بنیادی حقوق حاصل ہوں گے تو یہ ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ کہلایا جائے گا۔ نسرین کے کردار کا المیہ یہ ہے کہ یہ کردار معاشی طور پر آزاد نہیں۔ بوڑھا کرنل اس کو اپنی حوس کا نشانہ بناتا ہے اور مسلسل بناتا ہے اس طرح عورت مشین کی صورت اختیار کرتی ہے یہ غیر انسانی رویہ جب برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو باقاعدہ چیخ اور دلیل سے نسرین مزاحمت کرتی ہے اور مردانہ سماج سے اپنے اوپر کئے گئے ظلم و تشدد پر سوال کرتی ہے کہ ایسا کیوں؟ بطور انسان کیوں نہیں مانتے؟ ہم انسان نہیں؟ ہم معاشرے میں صرف تسکین کے لئے ہیں؟ یہ سوالات مردانہ سماج کی درندگی اور ظلم و بربریت کے خلاف ایک بھرپور عملی احتجاج ہے۔

" نادار لوگ" ، ایک ایسا منظر قاری پر عیاں کرتا ہے کہ بے بسی اور لاچارگی کا شکار کردار کس قدر اذیت کا شکار ہوتا ہے۔ یہاں پر " نادار لوگ" میں مردانہ اور زنانہ کردار کی تفریق الگ جگہ لیکن ایک کرب، بے چینی اور اضطراب کی طرف اشارہ " نادار لوگ" ہی ہے۔

ناول کا اعجاز، سرفراز، کنیز اور نسرین ایک اجتماعی بے بسی اور ناداری کا عملی مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں ناول جہاں ختم ہو رہا ہے قاری پر سوالات کی بارش شروع ہوتی ہے کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے کس قدر بے بس ہو کر ایک دوسرے پر جبر و تشدد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بے شک انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اس کی عکاسی ہمیں اعجاز اور سرفراز کے کرداروں کے ذریعے ہوتی ہے کہ ناول میں عورت ذات کو عیاشی کے سامان کے طور پر استعمال کرتے ہیں جبکہ آخر میں یہ کردار اجتماعی خدا ترسی اور بے بسی کی تصویر نظر آتے ہیں۔ " نادار لوگ" اپنے اوپر ہوئے ظلم و بربریت کا نوحہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، سہ ماہی تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۵

۲۔ طاہرہ صدیقہ، دوسری جنگِ عظیم کے اردو ادب پر اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱

۳۔ ڈاکٹر محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۵۴۷

۴۔ عاصم بٹ، عبداللہ حسین، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۰۸، ص ۱۰۲

۵۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲

۶۔ ایضاً، ص ۷۶۵۔۷۶۶

باب چہارم:

قید میں نسائی کرداروں کا مزاحمتی رویہ (نسائی رد تشکیل کے تناظر میں)

الف: مذہب کے نام پر استحصال کے خلاف عورت کا مزاحمتی رویہ

اداس نسلوں کی کہانیوں کے مصنف عبد اللہ حسین نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز عہد ساز ناول "اداس نسلیں" کی اشاعت کے ساتھ کیا اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اسے "اداس نسلیں" کی خوش قسمتی کہہ سکتے ہیں کہ اس اشاعت کے بعد سے ہماری ہر نسل اُداس سے اُداس تر ہوتی گئی ہے دوسری طرف یہ ناول نام کے لحاظ سے اسم بامسمیٰ ہے کہ اس کا ہر کردار ایک خاص قسم کی کرب، بے چینی، اُداسی، تنہائی، بیگانگی اور اضطراب کا شکار ہے۔

جو شہرت "اداس نسلیں" کے حصے میں آئی وہ عبد اللہ حسین کے کسی دیگر ناول کے حصے میں نہیں آئی۔ حالانکہ خود عبد اللہ حسین نے اپنے ناول "باگھ" اور "نادار لوگ"، کو "اداس نسلیں" سے بہتر قرار دیا۔ ان کا ہر ناول ہی اپنے موضوع، اسلوب اور کردار نگاری کے لحاظ سے ایک دوسرے سے منفرد اور اہم ہے ہر بڑا تخلیق کار جب ادب تخلیق کرتا ہے تو اس کے پیش نظر اپنا عہد ہوتا ہے وہ اپنے زمانے کے ساتھ بامعنی مکالمہ کرتا ہے اور اپنے عہد کو اپنے وژن سے متاثر کرتا ہے اس طرح ہر بڑی تخلیق، ہر فن پارہ آنے والی نسلوں کے ساتھ ان کے عہد کے تقاضوں کے مطابق بامعنی مکالمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے دراصل یہی خصوصیت ہی اسے ادبی دنیا میں حیات جاوداں عطا کرتی ہے۔

عبد اللہ حسین کا تیسرا ناول "قید" ہے جو "اداس نسلیں" اور "باگھ" کے بعد ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول مذکورہ دونوں ناولوں سے ضخامت اور اسلوب کے علاوہ بھی کئی لحاظ سے مختلف و مختصر ہے "قید" کل پانچ ابواب اور ایک اختتامیہ پر مشتمل ہے پورا ناول ایک سو پندرہ صفحات پر مشتمل ہیں۔ تجسس سے بھرپور اور کئی جاسوس ناول کا اسرار رکھنے والی یہ کہانی گنتی کے چند کرداروں کے گرد بنی گئی ہے۔ موضوع رکھوال کے انقلابی خیالات رکھنے والے دو دوست کرامت علی اور فیروز شاہ۔ فیروز شاہ کا والد مولوی احمد شاہ (نانگا سائیں) جو بظاہر بڑا دین دار متقی اور پرہیز گار ہے۔ مگر اندر سے بہت سخت اور شقی القلب انسان ہے۔ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک آزاد خیال اور متحرک لڑکی رضیہ سلطانہ اور بظاہر ایک غیر اہم سا کردار مائی سروری۔ یہ اس ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ رضیہ سلطانہ فیروز شاہ کے ناجائز بچے کو جنم دیتی ہے جسے نومولودگی میں بڑی بے دردی کے ساتھ سنگسار کیا جاتا ہے رضیہ سلطانہ اس عمل پر نیم پاگل ہو جاتی ہے لیکن بعد میں اس کے حواس بحال ہو

جاتے ہیں اور انتہائی شاطرانہ و سنسنی خیز اور ڈرامائی طریقے سے تین قتل کر دیتی ہے۔ ان تینوں میں مراد، چوہدری محمد اکرم اور علی محمد ترکھان شامل ہوتے ہیں۔ ان کو بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا جاتا ہے اور پھر خود کو پولیس کے حوالے کر کے اعتراف جرم کر لیتی ہے اس کے بعد اسے چپ لگ جاتی ہے اور مرنے سے قبل صرف اس وقت بولتی ہے جب اسے پھانسی دی جانے والی ہوتی ہے۔ وہ پہلی مرتبہ ان تین قتلوں کی کہانی سناتی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ موضع رکھوال کے مولوی احمد شاہ کے سامنے توبہ کرے گی جو اس کے عاشق اور بے مراد فیروز شاہ کا باپ ہے۔ اس موقع پر مولوی احمد شاہ کے علاوہ لیڈی وارڈن مسعودہ خانم اور مرحوم فیروز شاہ کا جگری دوست کرامت علی موجود ہوتے ہیں۔ اب کرامت علی آفسر جیل ہے اور کالج کے زمانے میں رضیہ سلطان کا عاشق تھا لیکن اپنے جگری دوست کے مقابلے میں اس عشق کی راہ سے دستبردار ہو گیا تھا۔

رضیہ سلطانہ میران تین افراد کے سامنے اپنے جرم کی لرزہ خیز داستان بیان کرتی ہے اور اپنی مجروح ممتا کی تسکین کے لیے وہ جس طرح کا مظاہرہ کرتی ہے اسے دیکھنے والے دو افراد تو صریحاً اور ایک قیاساً مکمل طور پر بدل جاتے ہیں۔ ان حیرت انگیز اتفاقات سے جنم لینے والے واقعات سے متاثر ہو کر کرامت علی جیل کی نوکری سے استعفیٰ دے دیتا ہے۔ اس کے باطن میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہے جو اسے کسی عورت کے قابل نہیں چھوڑتیں حالانکہ بیوی، بچے پر مشتمل اس کا ایک بھرپور گھرانہ ہے اس واقعے کے بعد کرامت علی سرکار کی نوکری چھوڑ کر گاؤں چلا آتا ہے گاوں میں وہ کوئی اور کام نہیں کرتا بلکہ پورا دن مسجد میں گزارتا ہے ایک دن کرامت علی سجدے میں ہوتا ہے کہ اتنی میں ایک خاتون اپنے بچے کو لے آتی ہے اس پر بغیر کچھ پڑھے پھونک مارتا ہے اور وہ ٹھیک ہو جاتا ہے اس کے بعد اس کی شہرت گاؤں گاؤں اور شہر شہر پہنچ جاتی ہے مختصر یہ کہ وہ ایک جیلر سے ایک صوفی منش انسان بن جاتا ہے نامعلوم اور غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھوں مخلوق خدا کی مشکل کشائی ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے علاقے کا نامی گرامی پیر بن جاتا ہے۔

"حجرہ پاک" حضرت پیر کرامت علی شاہ براقی عرف بابا چدر پوش بانی گدی شریف کچا کھوہ سلسلہ کرامتیہ، کے باہر ناگا سائیں پڑا رہتا تھا جو سوائے بچوں کے ہر کسی کے ساتھ حتی کہ پیر کرامت علی شاہ کے ساتھ بھی نہایت برہمی سے پیش آتا تھا۔ ناول میں اس کا انجام بڑا عبرتناک بتایا گیا ہے۔ یہ ناگا سائیں رضہ سلطانہ کے بچے کو سنگسار کرنے والا مولوی احمد شاہ ہے۔

اس ناول کا پلاٹ انتہائی ڈرامائی ہے۔ کہانی اتنی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے کہ قاری کو سانس روک کر واقعات کی کڑیاں جوڑنی پڑتی ہیں۔ تجسس پیدا کرنے کے لیے یہ تکنیک استعمال کی گئی ہے کہ اسباب بتائے بغیر پہلے

نتائج کا ایک منظر نامہ پیش کیا جاتا ہے۔ پھر گزشتہ واقعات کے بیان کے ذریعے سلسلہ اسباب کا تانا بانا بن کر قاری کے تنے ہوئے اعصاب کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کا واسطہ اس طرح کے اسرار سے پڑتا ہے جو جاسوسی ناولوں کا خاصا ہے۔ مگر قید کوئی جاسوسی ناول نہیں ہے۔ جو شے اسے عام جاسوس ناولوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا چوتھا بعد ہے۔ یعنی وہ گہری انسانی معنویت جس سے جاسوسی ناول بالعموم عاری ہوتے ہیں۔ یہی وہ پہلو ہے جو قید کو نہایت فنکارانہ طور پر ادبی ناولوں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ ان سب پر مستزاد عبد اللہ حسین کا وہ خوبصورت اسلوب جو اس ناول میں گو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تو نہیں لیکن اس کے باوجود جادو جگاتا ہے۔

زندگی ایک تغیر اور بہاؤ کا نام ہے جو تسلسل کے ساتھ جاری ہے اس میں کبھی اور کسی وقت انقطاع نہیں ہوتا۔ مگر کیا یہ بہاؤ خود جاری ہے؟ ممکن ہے یہ خود بخود والا تصور فلسفے میں قابل قبول ہو مگر ادب میں نہیں چل سکتا۔ ادب کسی ایسے مجرد تصور کو نہیں مانتا جس میں انسانی شعور ارادے اور عمل کا دخل نہ ہو کیونکہ زندگی کے ان تبدیلیوں کا ادراک انسانی معاشرے کے بغیر ممکن نہیں۔ زندگی انسان پر اور انسانی فکر و عمل زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تاثر پذیری اور تاثر ریزی کسی خط مستقیم کی طرح نہیں ان کی کوئی ابتداء اور انتہا نہیں۔ دائرے کے محیط کی طرح اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں ہوتا۔

بالکل اس طرح انسانی فکر ماحول پر اور ماحول انسان پر اثر انداز ہوتا ہے انسان مطلق خیر نہیں۔ مطلق شر نہیں۔ نوری ہے نہ ناری ہے بلکہ دونوں کا مرکب ہے تضادات کی رزمگاہ ہے۔ زندگی کی رنگارنگی انہی تضادات سے پیدا ہوتی ہے انسانی تضادات کی یہی وہ کشمکش ہے جسے میں انسانی معنویت کہتا ہوں اور ادب نام ہی اسی انسانی معنونیت یا حسیت کے مطالعے کا ہے۔

کامل فن پارہ وہ ہے جو انسانی حسیت کے مکمل اظہار کے ساتھ ساتھ قاری کے اندر جمالیاتی لطف اندوزی بھی پیدا کرتا ہے۔ فنکار کا موضوع انسانی معنویت ہے مگر وہ اسے اپنے اسلوب، زباں و بیان اور چیزوں کے بارے میں اپنے نقطہ نظر تاثرات و تعصبات اور منفرد تخلیل کی آنچ رہتا جو کہ اصل میں تھا بلکہ وہ زائد اصل بن جاتا ہے۔ کسی کامل اور متوازن فن پارے کو زندگی کی معنویتوں سے جدا بھی نہیں کیا جا سکتا مگر وہ زندگی کا ایک بے تہہ اقتباس بھی نہیں رہتا۔

عبد اللہ حسین کی اکثر تحریریں اسی توازن کی مثال ہیں مگر قید میں یہ توازن قدرے بگڑ گیا ہے۔ اس میں انسانی معاملات و معنویت اتنی شدت اور ہدایت کے ساتھ آئے ہیں اور انہیں اتنے چونکا دینے والے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں جمالیاتی، ابتراز پیدا کرنے والے عناصر تقریباً دب گئے ہیں حالانکہ کسی فن

پارے کے یہی وہ عناصر ہیں جن کی بنا پر آپ اسے بار بار پڑھنے پر بھی بے لطف نہیں ہوتے ورنہ جہاں تک محض واقعات کا تعلق ہے تو وہ خواہ کتنے ہی سنسنی خیز اور جاذب توجہ کیوں نہ ہوں آپ انہیں ایک سے زیادہ مرتبہ نہیں پڑھ سکتے "قید" کا معاملہ کسی حد تک یہی ہے۔

" قید" بہر حال ایک ایسا ناول ہے جو قاری کی توجہ کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے یہ صرف اس لیے ممکن ہے کہ ناول میں جو زندگی کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے ایک تو وہ ہمارے ارد گرد بڑی سفاکی کے ساتھ موجود ہے اور دوسرے ان واقعات کو جن کرداروں سے بنا گیا ہے ان میں زندگی کی حرکت انتہائی نامیاتی اور فطری انداز میں موجود ہے۔ ماحول اور معاشرہ انسان کے اندر بالکل غیر محسوس طور پر اقدار اور معیارات کے حوالے سے تبدیلیاں پیدا کرتا ہے افراد ان میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور پھر افراد بھی ماحول پر اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں اگرچہ ان میں داخلی طور پر اس کے خلاف کشمکش بھی جاری رہتی ہے مگر مختلف انداز کی تحریص و ترتیب ان پر غالب آجاتی ہے مثلاً کرامت علی کا ابتدا میں دم و درود اور تعویذ گنڈے سے اجتناب اور پھر بعد میں حیثیت کی تبدیلی اور حلقہ ارادت کی وسعت کے ساتھ ساتھ گدی کے نام والقاب میں ترمیم اور اضافہ اور پیری مریدی میں نام پیدا کرنے کے بعد میدان سیاست میں اترنے کی تمنا۔ اس کے ساتھ انسان کی وہ امتیازی صنعت یعنی بشریت کہ وہ بہت پاکباز ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات انتہائی شقی القلب ہو جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس ناول میں موجود ہے۔ عبد اللہ حسین کا فنی شعور اسے مکینکل نہیں بننے دیتا۔ اسی زندہ اور متضاد کشمکش سے بھرپور مواد وہ شے وجود میں آتی ہے جسے فن پارہ کہتے ہیں۔ اب ایک نظر زندگی کے ان رویوں پر جو قید میں زیر بحث آتے ہیں۔ اجتماعیت پرستی اور قوم کی تعمیر یہ محض دو جملے ہی نہی بلکہ ایک پورے مزاج اور نفسیات کا نام ہے جس نے ہمارے عوام اور تمام مذہبی و سیاسی جماعتوں کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ کچھ نہ کرنا اور سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں رکھنا اور مست رہنا اجتماعیت پرستی ہے اور قوم کی تعمیر اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے معاشرتی زوال اور در بدری کے بے شمار اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم من حیث القوم صرف ملک و ملت کے ناخدائی اور عوام کی بھلائی جیسے بڑے بڑے کام کرنے کے جنوں میں ہیں۔ ہمیں عام افراد اور ارد گرد کے چھوٹے چھوٹے انسانوں سے کوئی تعلق نہیں "قید" میں اسی نفسیاتی مزاج کا نمائندہ فیروز شاہ ہے۔ اس کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''سن چھیالس سنتالیس کا زمانہ تھا۔ تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ فیروز شاہ کالج پہنچتے ہی طالب علمی سیاست میں کود پڑا۔ اس کے اندر لیڈر شپ کی قدرتی صفات موجود تھیں اور وہ اپنی زور دار شخصیت کی بدولت کالج کی اسٹوڈنٹ مسلم لیگ کا سیکریٹری منتخب ہو گیا''۔[۱]

اس دور کے بعد بھی صورت کچھ مختلف نہ ہوئی۔ ترقی پسندی، اسلام پسندی اور مختلف اقسام کی پسندیوں نے ہزار ہا ایسے لوگ پیدا کر دیے جو عام انسانی تعلقات کی پاسداری میں صفر ہوتے ہیں مگر ملک و قوم کی تقدیر بدلنے کے زعم میں برق ثیاں۔ اصل میں سیاست گر دی نے ہر شے، ہر قدر اور ہر تعلق کو گدلا دیا ہے۔ وہ کام تو کام نہیں جس میں دعویٰ نہ ہو، شور نہ ہو، شہرت نہ ہو اور ہنگامہ آرائی نہ ہو۔

فیروز شاہ بھی ایک ایسا نوجوان تھا جو دنیا کو بدلنے کا عزم رضیہ سلطانہ کا محبوب مگر عام زندگی میں ناکام۔ رضیہ سلطانہ بھی کرامت علی کے مقابے میں فیروز شاہ پر مرتی تھی اور ساری زندگی مرتی رہی مگر اس سے شادی نہیں کرتی۔ کرامت علی کے لیے یہ تضاد معمہ تھا۔ رضیہ سلطانہ کی پھانسی کی رات وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے فیروز شاہ سے شادی نہ کرنے کا سبب پوچھتا ہے۔

''کیوں کرتی وہ پھٹ سے بولی، ساری دنیا کا درد دل میں لیے پھرتا تھا جب میرے پاس آتا تو دو منٹ میں لڑھک جاتا اور منہ پرے کر کے خراٹے لینے لگتا''۔[۲]

پوری دنیا کا درد دل میں لیے پھرنا مگر اپنے پڑوسی، اپنے ماتحت کلرک، اپنی جماعت کے کارکن سے تنہائی میں ملنا تک گوارنہ ہونا۔ اپنے گھر کے حالات اپنی بیوی کے بیراگ، اپنے بچوں کی معصوم کھیلوں سے لاتعلقی یہ ہے اجتماعیت پرستی اور قوم کی تعمیر کے آوردش وادیوں کے خصائل۔۔۔۔ پھر کرامت علی رضیہ سلطانہ سے پوچھتا ہے کہ تمہیں تو فیروز سے محبت تھی۔

''محبت کا کیا''، وہ بولی، ''ایک بار ہو گئی تو ہو گئی اس کے بعد تو سلوک کی بات ہوتی ہے سلوک کا تم لوگوں کو کیا علم؟ ایک بات بتاؤ، میں تم سے پوچھتی ہوں۔ تم لوگوں کو دنیا بھر کی فکر لگی رہتی ہے۔ عوام عوام کرتے تمھاری باری نہیں آتی۔ ذرا بتاؤ عوام کون لوگ ہوتے ہیں؟''۔[۳]

عوام تو ایک واہمہ ہے ایک فریب ہے جس میں لیڈر لوگ اپنی انسانی سطح کے فرائض سے بھاگ کر پناہ لیتے ہیں۔ ''قید'' کے مذکورہ بالا اقتباس میں رضیہ سلطانہ نے عوام کا جو مطلب پوچھا ہے اس سے اس کی کیا مراد ہے؟ وہی جو بالعموم نہیں سمجھی جاتی ہے یعنی فرد۔ جس میں مرد بھی شامل ہے اور عورت بھی۔ اجتماعیت اور عوام

پرستی دراصل فرد کی وجود حیثیت سے انکار اور اس کو تسلیم کرنے سے فرار کا نام ہے۔ انہیں عام لوگ نظر نہیں آتے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے ضرورت مند لوگ نظر نہیں آتے نہ یہ لوگ ان کی مدد کرتے ہیں بلکہ یہ لوگ فیروز شاہ کی طرح نعرے لگاتے ہیں اور عملی طور پر معاشرے کے لیے کچھ نہیں کرتے حتیٰ کہ اس سارے عمل میں یہ اپنے گھر والوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں رضیہ سلطانہ جیسے کردار جنم لیتے ہیں۔

رضیہ سلطانہ جنسی طور پر ناآسودہ ہے جس کا ذمہ دار فیروز شاہ ہے۔ مجرد عورت سے آگے بڑھ کر جب وہ ماں بنتی ہے تو اس کی ممتا کو کچل دیا جاتا ہے جس کا ذمہ دار فیروز شاہ کا والد احمد شاہ ہے۔ عورت کی جنسی ناآسودگی اور اس کے بے قرار ممتا "قید" میں عورت کے یہ دونوں جذبے بڑے مجروح نظر آتے ہیں اور اس سے وہ المیہ جنم لیتا ہے جس کے بیان میں عبداللہ حسین نے بڑی سفاکی اور لرزہ خیزی کا مظاہر کیا ہے۔

رضیہ سلطانہ ایک ناآسودہ عورت ہے اس کے جذبات کو نہ اس کا عوام پرست عاشق فیروز شاہ سمجھ سکا اور نہ اس کے عاشق کا والد متقی و پرہیز گار مولوی احمد شاہ۔ عورت کے عورت پن کے انکار کا یہ پہلو "قید" میں بہت خوبصورتی سے آیا ہے اور قاری کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اہل سیاست اور ظاہر پرست مذہبی لوگ عورت کے جذباتی وجود کے یکساں طور پر کیوں منکر ہیں؟

اہل مذہب پر تو خیر یہ الزام ہے کہ انہوں نے ہمیشہ سے عورت کا حق مار رکھا ہے مگر "قید" میں روشن خیال طبقے کا بھی بیاں ہے جو بالعموم آزادی نسواں اور حقوق نسواں کا چمپین تو بنتا ہے دل خوش کن نعروں کی بات جانے دیجیے۔ نعرہ تو نعرہ ہوتا ہے اصل مسئلے سے توجہ ہٹانے کے لیے ہے۔ انسان کے اصل موقف کا پتہ تو روزمرہ زندگی کے عام معاملات میں چلتا ہے کہ آپ بالکل انسانی سطح پر عام انسانوں سے ان کے چھوٹے چھوٹے حقوق (اس میں عورت کے حقوق خاص طور پر شامل ہیں) کی رعایت میں کیا کرتے ہیں۔ دیکھا اکثر یہی گیا ہے اس معیار پر سب سے زیادہ ناکام لوگ وہی ہیں جو دعوؤں اور نعرہ بازی کا مزاج رکھتے ہیں۔ "قید" میں عورت کی اس ناقدری کا بیان بڑی خاموشی معروضیت اور ایک لحاظ سے بہت سرسری انداز میں آیا ہے۔ اتنا سرسری کہ بظاہر تو بہت غیر اہم سی بات لگتی ہے مگر بڑے حادثوں اور المیوں کی تہہ میں بعض اوقات کوئی معمولی سی بات ہی ہوتی ہے۔

"قید" کی کہانی کے تمام المیوں کے بیج درحقیقت رضیہ سلطانہ کے جبلی وجود کے انکار سے پھوٹتے ہیں اور پھر سارا معاشرہ اپنے تضادات اور خرابیوں سمیت اس میں جھلکنے لگتا ہے۔ یوں تو "قید" محض مولوی احمد شاہ (نانگا سائیں)، پیر کرامت علی شاہ اور مائی سروری کی قید ہی نہیں رہتی بلکہ یہ معاشرے کے ہر اس فرد اور طبقے کا استعارہ بن جاتی ہے جو اپنے کسی نہ کسی تصور خیال اور وہم کا قیدی ہے۔

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب کہ فنکار کچھ معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر کرتا ہے تو اس وقت اس کے پیش نظر یہ بات نہیں ہوتی کہ فلاں فلاں معاملے میں مذہب یا سیاست کے اصل تصورات و اقدار کیا ہیں جسے ناجائز بچے کے بارے میں شریعت کا حکم اس رویے سے بہت مختلف ہے جو مولوی احمد شاہ کا تھا۔ فنکار تو اس بات کو دیکھتا ہے کہ معاشرے میں ان تصورات و اقدار کی مروج صورت کیا ہے کیونکہ اکثر قصور یا قدر کی صحیح ترین صورت کی بجائے اس کی مقبول ترین اور مروج صورت زیادہ موثر (مثبت یا منفی معنوں میں) اور زیادہ فعال ہوتی ہے۔

"قید" میں یہ سب رویے نہایت واشگاف انداز میں موجود ہیں۔ عبد اللہ حسین کی توجہ ان پر اتنی شدت سے مرکوز رہی ہے کہ دیگر عناصر کسی قدر دب گئے۔ کہانی کے کردار بہت زندہ اور متحرک ہیں مگر ان کے بننے کے عمل سے قاری زیادہ واقف نہیں ہو پاتا۔ واقعات کا ایک گزران ہے جو بہائے لیے جاتا ہے ایسا شاید اس لیے ہوا کہ مصنف کے نزدیک اصل اہمیت معاشرے کے کردار کی ہے۔

"قید" کی کہانی کی ساخت ایک بند سے سٹرکچر کی حامل ہے۔ آخر میں مصنف اگر خود واقعات کی کڑیاں نہ ملاتے تو پوری کہانی ایک معمہ بن جائے۔ یہ چیز کہانی پر مصنف کی قدرت کی دلیل ہے مگر مصنف نے "قید" میں بھی حسب سابق کہانی کے بعض پہلو غیر واضح چھوڑ دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مائی سروری کون تھی اور نوجوان فیروز شاہ کی موت کا سبب کیا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ "قید" ایک جاسوس ناول نہیں ہے اور اسطرح کے معمے حل کرنا ضروری ہوں۔ کچھ سوالات کا بغیر حل کے چھوڑ دینا عبد اللہ حسین کے ہاں بطور تکنیک موجود ہے اور شاید اس کی وجہ ہے کہ خود ہماری روز مرہ سیدھے سادے سماجی حقائق ہیں۔ جو کہیں تو ایک مذہبی معاشرے میں موجود تو ہمات وضعیف العیتقادی کے سبب نام نہاد مذہبی لبادوں میں ملبوس اور کہیں بالکل انسانی سطح پر اس زمانے کے مخصوص رجحانات میں جھلکتے ہیں اور کہیں عورت کی جبلی ناآسودگی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ناول میں انہیں رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

سب سے اہم رویہ گدی نشینوں، پیروں کی فسوں کاریوں کا ہے اس میں جسمانی لذت اندوزی، مصیبت کوشی، ہوس جاہ و جلال، خواہش اقتدار اور میدان سیاست میں اترنے کے خواب بھی کچھ شامل ہیں۔ ایک لاطینی مقولہ ہے کہ "معاشرے کے بہترین افراد کرپٹ ہو جائیں تو بدترین کرپشن ہے"۔ کہ مصداق مذہب کے بہترین حصے یعنی تصوف کی کرپشن بھی اپنی بدترین انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ نفس پرور اہل جبہ و دست کے ہاتھ چڑھ کر تصوف بندے اور خدا کے درمیان تعلق جوڑنے کا نام نہیں رہا بلکہ انتہائی منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔ معاشرے میں جو

بڑے بڑے استحصالی طبقات موجود ہیں۔ ''پیران طریقت'' ان سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ سادہ لوح عوام کو اپنے چنگل میں اس طرح پھنسائے ہوئے ہیں کہ صید زبوں حال بھی مست ہے۔ اس طبقے کا سماجی کردار اپنی تمام مکاریوں کے ساتھ قید میں پیش کیا گیا ہے۔

کرامت علی شاہ ایک حادثے کے نتیجے میں پیر بن گیا۔ ایک نئی دنیا میں اس کی آنکھ کھلی۔ اس کے سامنے پیری مریدی کی صورت میں خزانے کا منہ کھل گیا۔ پیری مریدی کی وہ بساط جو اچانک اس کے سامنے بچھ گئی تھی وہ اس پر نہایت شاطرانہ چالیں چلنے لگا۔ اس کی ذاتی کرامتوں اور کچھ اپنی چوہان برادری کی تائید و قوت سے اس کا حلقہ ارادت پھیلنا شروع ہوا۔ ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے بعد سیاست کی جو صورت حال بنی اس میں کرامت علی شاہ کی مرشدی خوب چمکی کیونکہ کئی سابقہ و موجودہ فوجی افسر اس کے مرید بن گئے اب پیر صاحب میدان سیاست میں جھنڈے گاڑنے کے خواب دیکھنے لگے۔ اس کی تعبیر انہیں اپنے بیٹے صاحبزادہ سلامت علی کی صورت میں ملی۔ ''قید'' ناول کا یہ اقتباس پیش خدمت ہے۔

> ''فقیری تو مل گئی۔ اب وزیری رہ گئی تھی۔ اس کے بعد دنیا جہاں ان کی ہتھیلی کے اندر ہو گا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بیٹے کو ایسے پروان چڑھایا تھا جیسے کسی اصیل گھوڑے کو گھوڑ دوڑ کے لیے پالا جاتا ہے''۔(۴)

سلامت علی اور کرامت علی دونوں میں سیاسی امنگیں قدر مشترک کام کرتی ہیں۔ سلامت اس لحاظ سے باپ سے الگ ہے کہ وہ شہوت پرست بھی ہے کرامت علی کی پاکبازی کی وجہ صرف یہ ہے کہ جسمانی طور پر وہ جنسی فعل کے قابل نہیں رہا۔ سلامت علی اپنے حلقہ ارادت کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کیمونسٹوں کی پارٹی تنظیم سے بھی مدد لیتا ہے۔ لیکن دل میں کمونسٹوں کے لیے نفرت رکھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ کمونسٹ اللہ تعالیٰ کی واحدنیت پر یقین نہیں رکھتے اور یہ دہریے لوگ ہیں لیکن ساتھ ساتھ ان پارٹی کی تنظیم کی تعریف بھی کرتا ہے۔

> ''ان کا فلسفہ تو دہریہ خیالات کی بنیاد پر ہے مگر ان کی تنظیم لاجواب ہے ہمیں برے لوگوں کی اچھی باتیں اپنانے میں عار نہیں ہونی چاہیے''۔(۵)

سلامت علی شاہ سیاست میں جھنڈے گاڑنے کے دوران اس کے حل میں برہنہ جسموں سے لطف اندوز ہونے کا خیال اس کے دل میں ابھرتا ہے۔

یہ پیری مریدی کھیل کی وہ جھلک جو خوف خدا سے عاری ایک معاشرے میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ زوال کی یہ صورت مذہب کے ہر گوشے میں نمایاں ہے۔ پیر کرامت علی شاہ کی باطنی دنیا اور جعلی روحانیت ہی کی طرح ظاہر پرست مولوی احمد شاہ کی عمر بھر کی عبادت و ریاضت بھی اس کے اندر بہیمیت کو نہیں بدل سکتی اور وہ مسجد کی سیڑھیوں میں پائے جانے والے نومولود بچے کو (جو در حقیقت اس کا اپنا پوتا ہے) بڑی بے رحمی سے سنگسار کرا دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "مسجد کی حرمت کے بارے میں خدا کے سخت احکام ہیں"۔

ظاہری طور مذہب پرست اور حامیان شرع متین کہ وہ یہ اہندوناک باطنی بے حسی ہے جو ہمیشہ لفظ قانون کے نام پر پھر پر روح قانون کی دھجیاں اُڑاتی ہے اور اس کو تقاضائے شریعت سمجھا جاتا ہے۔

i. قید کا مطالعہ سیاسی و سماجی تناظر میں

اُردو ناول میں کئی ایسے نام لیے جاسکتے ہیں جو گہرا سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور اپنے ناولوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں اور اس خصوصیت کی بنیاد پر وہ اُردو فکشن میں زندہ و جاوید ہو گئے ان میں پریم چند، کرشن چندر، فضل کریم فضلی، جملیہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر کے نام قابل ذکر ہیں۔ عبد اللہ حسین کا نام بھی اس قبیل کے ناول نگار میں شامل ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے ناولوں میں مافوق الفطرت کائنات سجانے کے بجائے حقیقی زندگی کی تصویر پیش کی۔ ان کے متعدد ناول ("اداس نسلیں"، "باگھ"، "قید"، "نادار لوگ" اور "رات" منظر عام پر آئے۔ انھیں جس ناول سے شہرت نصیب ہوئی وہ "اداس نسلیں" ہے۔ اس ناول میں ایک ایسی نسل کا قصہ بیان ہوا جس نے برصغیر کو ملک بنتے ہوئے دیکھا، ایک معاشرے کو بکھرتے دیکھا، جاگیر داری سماج کی اخلاقیات کی شکست و ریخت دیکھی اور ہجرت کے کرب کو بھی محسوس کیا۔ عبد اللہ حسین نے اس ناول میں قیام پاکستان سے پہلے الجھی ہوئی سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال کو گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ "اداس نسلیں" اپنے عہد کا سیاسی اور معاشرتی مرقع ہے۔

لیکن اس میں صرف ایک جہت ایسی ہے جیسے یہاں نظر انداز کیا گیا ہے اور وہ ہندوستانی سیاست و معاشرت میں مذہب کا عمل دخل اور ملا کا کردار ہے جو اس دور کا اہم ترین عنصر ہے اور جسے اس دور کے کسی لکھنے والے نے نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن اس کی کمی کو انہوں نے اپنے ناول "قید" میں پورا کر دکھا دیا ہے۔

"قید" عبد اللہ حسین کا ایک اہم ناول ہے جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے جس میں قید کو بطور استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس ناول میں قید نفسانی خواہشات کی قید ہے، جو پورے ناول کو اپنے حسار میں لیے ہوئے ہیں۔ ناول کے آغاز میں ایک نو سال بچہ جب عریاں جسموں کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ہلچل مچ جاتی ہے

یہ ہلچل آگے چل کر ننگے جسموں پر ہاتھ پھیر کر تسکین حاصل کرنے کا عادی ہو جاتی ہے۔ مذکورہ ناول میں یہ قید نفسیاتی اور جسمانی کمزوری کی شکل اختیار کرتی ہے۔ عمر کے ابتدائی دور میں انسان جب بلوغت کی منزل پر ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں ہر وقت ہیجان بپا رہتا ہے وہ چھوٹی سی بات پر خوشی سے اچھلنے لگتا ہے اور معمولی سی بات پر خفا بھی ہو جاتا ہے۔ یہ کومل جذبات اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس ہیجان خیزی کے عمل میں نو عمر لڑکے اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں سے جنسی لطف کے حصول میں عائل ہو جاتے ہیں اور بعض لڑکیاں ادھیڑ عمر کے مردوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہیں ناول کے ابتدا میں یہی کیفیت عبد اللہ حسین نے قید میں دکھانے کی کوشش کی ہے جہاں نو سالہ بچہ سلامت علی مائی سروری کے چوتڑوں سے لذت کشید کرتا ہے۔

عبد اللہ حسین کا ناول "قید" بہت کم ضخیم ہے اختصار کے پیرایے میں کہانی بہت تیزی سے ڈرامائی موڑ لیتی ہے۔ اس سے نثر میں تناؤ پیدا ہوتا ہے اور قاری کو بھی کہانی کے ساتھ تیز بھاگنا پڑتا ہے فائدہ تو ہو کہ قاری کی توجہ ناول سے ہٹتی نہیں لیکن تنی ہوئی نثر کہانی کا مزہ بھی خراب کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات پڑھنے والے کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ناول کا موضوع جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قید ہے۔ یہ قید معاشرتی بھی سیاسی بھی ہے اور مذہبی اور سماجی بھی ہے اور جنسی بھی ہے تاہم بیشتر ناقدین نے "قید" کو سیاسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ناول "قید" ایک مسلسل استعارہ ہے یہ انسان کی محرومیاں و مجبوریاں اور سماجی ناہمواریوں کی ایک مبہم علامت سمجھی جاسکتی ہے عبد اللہ حسین کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے عہد کی ہر قسم کی ناہمواری کے موضوع کو ناول بناتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ناول کا بنیادی حوالہ سیاسی ہے اور اس کی کہانی مارشل لاء کے دور حکومت میں بنی گئی۔

اگر اس ناول کو ضیاء الحق کے دور حکومت کے پس منظر میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ یہ دور خواتین کے حقوق کے حوالے سے سیاہ ترین دور تھا۔ کیونکہ جنرل ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان کے جس آئین کو معطل کیا اس میں پاکستانی عورت کو پاکستانی مرد کی مساوی حقوق دیے گئے تھے اس کی جگہ ۱۹۸۰ء میں ضیاء الحق نے چار اسلامی تعزیراتی قوانین نافذ کیے جن میں حدود آرڈیننس بھی شامل ہے۔

جس سے عورتوں کے حقوق پر کاری ضرب لگی۔ حدود آرڈیننس کا اجرا کر کے عورتوں کے حقوق کو سلب کیا گیا۔ ان قوانین کے تحت حکومت پاکستان کا اسلام کسی ایسی مظلوم عورت کو تحفظ دینے سے قاصر ہے جو بد قسمتی سے عصمت دری کا شکار ہوئی ہو کیونکہ عورت ہونے کی وجہ سے اس گھناونے جرم کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف اس کی تنہا گواہی اس مرد کو سزا نہیں دلا سکتی۔

ضیاء الحق کے زمانے میں پہلی مرتبہ یہ ہوا کہ پاکستانی جیلوں میں قید کی جانے والی ان عورتوں کو شدید جسمانی اذیتیں دی گئیں جو سیاسی جدوجہد کے الزام میں جیل میں گئی تھیں۔ ان کے دور حکومت میں سیاسی جدوجہد صفورانی کو جیل میں ان کے جسم کو سگریٹ سے داغا گیا تھا۔ اس دور میں عورت کو جن سماجی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ سلسلہ آج تک کسی نہ کسی صورت میں اب بھی موجود ہے۔

ضیاء الحق جیسے بے شمار مرد آہن آئے اور انہوں نے خواتین پر سیاسی و سماجی پابندیاں لگائیں لیکن وہ اپنے مکروہ مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ضیاء الحق نے حدود آرڈیننس کی آڑ میں خواتین پر بے شمار پابندیاں لگائیں اور ان کو ترقی سے روکا اور ان کے حقوق پر ڈاکا ڈالا لیکن اس کے باوجود خواتین آج اسی منفی ہتھکنڈوں کا مقابلہ کر رہی بلکہ ڈٹ کر اپنے حقوق کے لیے نہ صرف آواز اُٹھاتی ہیں بلکہ اپنا حق لینا بھی جانتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس ناول کا مرکزی کردار ایک عورت کا کردار ہے اس کردار کا نام رضیہ سلطانہ میر ہے عبد اللہ حسین کے ہاں عورت اکثر مظلوم نظر آتی ہے۔ لیکن اس ناول قید میں ایسا نہیں ہے اس ناول میں عورت کا کردار بہت متحرک ہے۔ عبد اللہ حسین کے اس ناول میں عورت بغاوت کرتی ہے اور وہ خاموش نہیں رہتی ہے وہ اپنے خلاف ہونے والے ظلم کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ یہاں عورت ماں کے روپ میں سامنے آتی ہے وہ کسی کو معاف نہیں کرتی بلکہ سب سے اپنا بدلہ لیتی ہے۔

عبد اللہ حسین کے ہاں مرد کردار مضبوط نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں عورت کردار جیسے خانہ پوری کے لیے رکھے گئے ہو۔ ناولوں میں تو دکھائی دیتے ہیں لیکن اکثر کہانی کے پس منظر اور خاصے غیر اہم حیثیت میں۔ لیکن "قید" میں عبد اللہ حسین ہمیں عورت ایک ماں کے طاقت ور روپ سے متعارف کرواتے ہیں۔ ایک عورت جو سماج کی اقدار کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے جو مردانہ معاشرے سے ٹکر لیتی ہے اور اپنے بچے کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے قاتل کا روپ اختیار کر لیتی ہے جو سماج کی قدامت پرستانہ شکل کو بدلنے کی خواہش کرتی ہے گو اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتی لیکن اس کا کردار ہمارے لیے ایک مثال کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو سماج میں روشن خیالی کا استعارہ بن جاتا ہے۔

اس حوالے ڈاکٹر جمال نقوی سہ ماہی ادبیات کے مضمون اُردو کا عہد ساز ناول نگار ''عبد اللہ حسین''میں لکھتے ہیں۔

''حسین کی دوسری کہانیوں کے مقابلے میں اس کہانی میں عورت کا مرکزی کردار ہے لیکن یہ عورت مظلوم ہو کر بھی جرات مندی کی علامت ہے جو سماج کی اقدار کے خلاف بغاوت کا حوصلہ رکھتی ہے۔یوں اس کا کردار سماج میں روشن خیالی کا استعارہ بن جاتا ہے''۔(۲)

ناول کا لوکیل بنیادی طور پر دیہات ہی کا ہے۔ تاہم اس کی کہانی کا کچھ شہر سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ دیہاتوں میں جاگیرداروں اور پیروں کی ملی بھگت کو عبد اللہ حسین نے اپنے زور قلم سے بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا۔کسانوں کی زندگی کی عکاسی کو ہمیشہ کی طرح عبد اللہ حسین نے بہت عمدگی سے اور پر اثر تفصیلات کے ساتھ کی ہے۔ دیہات میں مذہب کے نام پر پھلائی جانے والی تنگ نظری اور جہالت اس ناول کے اہم موضوعات میں سے ہے اس سے پہلے اُردو ناول میں کسی ناول نگار اتنے کھلے اور بہترین انداز سے بیان نہیں کیا۔

عبد اللہ حسین نے نہ صرف تنقیدی انداز میں ان موضوعات پر بات کی ہے بلکہ اپنے ناول کو میدان جنگ بنادیا جس میں خیر و شر باہم برسرپیکار ہیں۔ رضیہ سلطانہ مظلوم اور دوسری طرف چند ظالم کردار ہیں۔ لیکن اس جنگ میں رضیہ سلطانہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اسے کسی سماجی اور قانونی ادارے پر اعتبار نہیں ہوتا۔ جب امام مسجد بچے کو ناجائز قرار دے اسے سنگسار کروادیتا ہے تو پھر کس ادارے پر اعتبار کیا جائے۔ لیکن یہاں پر رضیہ سلطانہ خود یہ جنگ لڑتی ہے۔ لیکن اس جنگ میں جیت مظلوم کی ہوتی ہے لیکن مصنف پر اُمید نہیں ہے کیوں کہ قانون کو ہاتھ میں لے کر لڑی جانے والی جنگ ایک جرم ہے قانون شکنی ایک جرم ہے جو دونوں فریقوں نے کی ایک قانون شکن کو دوسرے قانون شکن نے مات دی ہے مجموعی طور پر شر کی جیت ہے خیر کی جیت تبھی ممکن ہے جب قانون اور سماجی ادارے مضبوط اور پابند قانون ہوں۔ یہ ناول کا نتیجہ ہے۔

''قید''ناول مختصر ہے لیکن اس کے باوجود اس میں بہت سے کرداروں سے تعارف حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے ان میں اہم ترین مائی سروری، سلامت علی، کرامت علی شاہ، فیروز شاہ، نسرین اور رضیہ سلطانہ کے کردار ہیں۔ تاہم سب سے موثر کردار رضیہ سلطانہ کا ہے جو کہانی میں تحریک کا بنیادی وسیلہ بنتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جیسا بلند آہنگ لہجہ عبد اللہ حسین کا اس ناول میں ہے ویسا ان کے دیگر ناولوں میں حتی کہ ''قید''کے بعد آنے والے ناول میں بھی نہیں ملتا۔ سارا پلاٹ ڈرامائی اور آپ کو چونکا دیتا ہے۔ خاص کر اس کا اختتام۔ اس ناول کو عبد اللہ حسین کے فکشن میں ایک اہم موڑ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اس سے پہلے عبد اللہ حسین کے ہاں عورت ایسے

طاقت ور انداز میں جلوہ گھر نہیں ہوئی۔ یہ ناول قیام پاکستان کے آس پاس کے زمانے کے واقعات بتاتا ہے کچھ واقعات پاکستان بننے سے پہلے بھی پیش آتے ہیں جب کہ ناول کا اختتام پاکستان بننے کے بعد کے زمانے میں ہوتا ہے۔ ہمیں اس نسل سے متعارف کرایا جاتا ہے جس نے قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کی اور آزاد ملک کے خواب کی تعبیر کے لیے اپنی جانوں کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ "قید" ایک ایسا ناول ہے جس میں نئے ملک میں موجود استحصالی قوتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس میں پاکستان بننے کے بعد کی سیاسی و سماجی صورتحال کو بیان کیا ہے۔

واقعات بچے کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں اس کے لیے ناول میں ایک چھوٹا بچہ ایک منظر دکھتا ہے۔ بچے کے ذہن میں یہ منظر ہمیشہ باقی رہتا ہے اور جوان ہونے پر ایک بار پھر اس منظر سے روبرو ہوتا ہے پیر سلامت علی اسے بتاتے ہیں کہ وہ تو اصل میں نامرد ہو چکے ہیں اور عورت کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ بیٹے کے اصرار پر وہ اسے رضیہ سلطانہ کا قصہ سناتے ہیں کہ کیسے وہ اس عورت کی وجہ سے نامردی کا شکار ہوئے۔

جرم عبداللہ حسین کا پسندیدہ موضوع ہے اور وہ اپنے ناولوں اور کہانیوں کا تانا بانا بنتے ہوئے اسے مرکزی نقطے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ تاہم اس کا استعمال صرف کہانی میں قاری کی دلچسپی پیدا کرنے کا بہانہ نہیں بلکہ جرم کے وہ نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

کہانی کی شروعات تین کرداروں سے ہوتا ہے جن میں کرامت علی شاہ، رضیہ سلطانہ اور فیروز شاہ شامل ہیں۔ یہ تینوں طالب علمی کے زمانے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ یہ تینوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ کہانی بہت جلدی خود کو رضیہ سلطانہ اور فیروز شاہ تک محدود کرتی ہے۔ کرامت علی شاہ گاؤں چلا جاتا ہے وہاں سے اس کی واپسی ایک پولیس افسر کے طور پر ہوتی ہے۔

فیروز شاہ ایک امام مسجد احمد شاہ کا بیٹا ہے تحریک آزادی کا ایک فعال کارکن تھا۔ فیروز شاہ کو سیاست میں زیادہ دلچسپی تھی فیروز ان نوجوانوں میں سے تھا۔ ملک و قوم کے لیے اپنی جان تک نچاور کرنے سے دریغ نہیں کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ کئی مرتبہ حوالات بھی جا چکے۔

پاکستان بننے کے بعد فیروز شاہ سیاست کا ایک ابھرتا ہوا ستارہ بن جاتا ہے۔ سیاست کے میدان میں فیروز شاہ اکیلا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اس کی دوست رضیہ سلطانہ شانہ بشانہ کھڑی ہوتی ہے رضیہ سلطانہ بھی تحریک آزادی کی ایک فعال کارکن ہوتی ہے وہ ایک غریب مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔

بڑے عرصے کے بعد جب کرامت علی شاہ کو موقع ملتا ہے تو وہ یہ سوال رضیہ سلطانہ سے کرتا ہے کہ جب اپ کو اس سے محبت تھی تو اس شادی کیوں نہیں کی تو وہ جواب دیتی ہے کہ انسان ایسے مرد سے شادی کر کے کیا کرتا جو صرف دوسروں کے لئے جینا جانتا ہے دو منٹ کی جنسی خواہش والا فرد کتنا وفادار ہوتا ہے؟ اس طرح کے تاثرات کا اظہار دراصل باشعور عورت کا ثبوت ہے۔

رضیہ سلطانہ کا کردار عبداللہ حسین کے دیگر کرداروں سے مختلف ہے رضیہ سلطانہ کا کردار عبداللہ حسین کی سوچ میں تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس وقت عبداللہ حسین یہ ناول تحریر کر رہے تھے اس وقت تانیثیت کی تحریک پاکستان میں بہت زور و شور سے جاری تھی۔ لبرل خواتین اپنے حقوق کے لیے آواز اُٹھا رہی تھی۔ رضیہ سلطانہ کا کردار یکسر مختلف ہے اس کا کردار عبداللہ حسین نے نہ اس پہلے کے ناولوں میں تخلیق کیا اور نہ اس کے بعد آنے والے میں تخلیق کیا۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو اپنے حقوق کے لیے نہ صرف آواز بلند کرتا ہے بلکہ معاشرے سے بغاوت بھی کرتا ہے بلکہ معاشرے کے مروجہ رسم و رواج کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی ہے اس کی ایک مثال یہ بھی دی جاسکتی ہے کہ وہ بغیر شادی کے فیروز شاہ کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہتی ہے۔

سماج میں عورت کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے رضیہ سلطانہ ایک موقع پر تلخ لہجے میں کہتی ہے:

> " تمہارے عوام میں ہم لوگ کہاں شامل ہوتی ہیں، میں خاموش رہا، بولی۔۔۔۔ ہم لوگ احساس کمتری لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ کوئی ہاتھ لگا جائے تو دوسروں کے منہ کی طرف دیکھتی ہیں۔ مردوں کے منہ پر بال نکلتے ہیں تو فخر سے دنیا کو دکھاتے ہیں۔ ہمارے منہ پر ایک ایک بال اُگ آئے تو شرم سے سر جھکا لیتی ہیں۔ ہماری چھاتیاں نکلتی ہیں تو شرم سے سر جھکا لیتی ہیں۔ خون جاری ہوتا تو شرم سے جھک جاتی ہیں۔ شادی کی رات گزارتی ہے تو شرم سے باہر نہیں نکلتیں "۔(۷)

رضیہ سلطانہ کے کردار کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کردار کے ذریعے سماج کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سماجی پابندیوں کے خلاف اور گھٹن زدہ سماج کے خلاف عملی آواز ہے۔

ایک موقع پر رضیہ سلطانہ فیروز شاہ سے پوچھتی ہے تا کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ وہ خواتین کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر آزاد خیالی کے باوجود اندر سے محض ایک مرد ہے جس کے لیے عورت اس کی جوتی ہی کے ہم پلہ ہے جسے وہ عوام میں شامل نہیں کرتا اور شاید انسانوں میں بھی نہیں۔

رضیہ سلطانہ کا غصہ اور اسے کے بچے کو مارے جانے کا دکھ اسے جوالا مکھی بنا دیتا ہے۔ وہ ان تینوں مردوں کو مار دیتی ہے جو اس کے بچے کو پتھر سے مار دیتے ہیں جبکہ جس شخص یعنی احمد شاہ کے کہنے پر بچے کو پتھروں سے مار مار کر قتل کیا جاتا ہے وہ رضیہ سلطانہ کی زبانی یہ سارا قصہ سننے اور یہ جاننے کے بعد کہ جو بچہ مرا، اسی کا خون تھا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اور مردود قیدی کی گرداں کرتا ہوا بھاگ نکلتا ہے۔

فیروز شاہ کے بچے کو رضیہ سلطانہ مسجد کی سیڑھیوں پر رکھ دیتی ہے وہ یہ سمجھتی ہے کہ یہ اللہ کا گھر ہے اور یہاں پر میرا بچہ بالکل محفوظ ہو گا اور اسے کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن خدا کرنی دیکھ الٹا مسجد کا مولوی احمد شاہ جو بچے کا دادا ہے لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہے وہ کچھ نمازیوں کو حکم دیتا ہے کہ اس بچے کو سنگسار کر دو۔ نمازی اس کے حکم کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ مولوی احمد شاہ بچے کو اس لیے سنگسار کر دیتا ہے کہ اس برائی کا اثر پوری بستی میں نہ پھیل جائے ایک نوزائید بچے کی ہلاکت نہایت بہمانہ واقعہ ہے جسے بچے کی ماں اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے لیکن کچھ بھی اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ممتا کے جذبے کو دبائے ہوئے ایک طرف چھپی بیٹھی رہتی ہے اس کرب کو عبداللہ حسین نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

> "جب مراد پتھر اُٹھا کر اُسے مارا پھر علی محمد نے اور چوہدری اکرم نے تو میں نے پہلی بار اُس کی ننھی سی چیخ کی آواز سنی۔ اس نوزائیدہ کے سر کے ملائم ہڈی جو ایک مٹھی میں دبا کر ٹکڑے کی جا سکتی تھی، بھاری پتھروں کی مار میں تھی اس وقت میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت تھی کہ میں ان تینوں کا کلیجہ نکال لیتی مگر ٹانگوں نے جواب دے دیا تھا۔ میرے حلق سے چیخ بلند ہونے لگی تو آواز بیٹھ گئی۔ بتا احمد شاہ بتا، تو اس بہمانہ جرم کا مرکب کیوں ہوا"۔[۸]

بچے کے قتل کے واقعے کے جرم میں کوئی شخص نہیں پکڑا جاتا کیونکہ پولیس آنے تک اس واقعے کے سبھی نشانات مٹا دیے جاتے ہیں۔ جیسے کے اس واقعے کی ساری ذمہ داری پورے گاؤں نے لی ہو۔ اس میں صرف رضیہ سلطانہ پکڑی جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے بچے کے تینوں قاتلوں، مراد، چوہدری اکرم، محمد علی کو موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔

جیل میں اپنے جرم کا اعتراف وہ مولوی کے سامنے کرنے کے خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ ان کی خواہش کی تکمیل کی جاتی ہے جیل میں وہ احمد شاہ کو بتاتی ہے کہ اس نے کیسے تینوں قاتلوں کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتارا ہے اس موقع پر ہمیں بہت تفصیل کے ساتھ تینوں مردوں کے قتل کی روداد بیان کی جاتی ہے یہ تفصیلات تکرار کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ وہ احمد شاہ سے کہتی ہے۔

" تم پوچھو گے میں نے تمہیں کیوں چھوڑ دیا۔ میرے دل میں آگ ان تین بے گناہوں کے خون سے ہی کیوں بجھ گئی۔ تمہیں میں نے کیوں نہ پکڑا۔ تو سنو۔ تمہیں میں نے اس لیے چھوڑ دیا کہ تمہیں تو اپنے ہاتھوں ہی سزا مل چکی تھی۔ کان کھول کر سن احمد شاہ، وہ معصوم جیسے تم نے اپنی زبان سے ملعون کہا وہ تمہارا پوتا تھا۔ کیا؟ احمد شاہ کھلے منہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر لرزہ طاری تھا پوتا؟ ہاں۔ فیروز شاہ کا بچہ تھا۔ اپنے ہاتھوں تم نے اپنی نسل کشی کی۔ یہ ایسی سزا تھی جو میں بھی تمہیں نہیں دے سکتی تھی"۔[۹]

رضیہ سلطانہ ڈرامائی انداز میں قاری پر ایک عجیب و غریب منظر عیاں ہوتا ہے تو قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عورت ذات کس قدر سخت جان ہوتی ہے۔

رضیہ سلطانہ گڈا احمد شاہ کی طرف لہراتی ہوئی کہتی ہے:

"او مولوی" وہ چنگھاڑی، "دیکھ یہ تیرا پوتا ہے" اس نے وہ گڈا احمد شاہ کی داڑھی میں گھسا دیا۔ اس کے ناڑ کو میں نے چھاؤں میں سکھایا ہے اور اس میں باندھ کر اپنی کوکھ میں لیے دھرتی ہو۔ یہ میری محبت کی نشانی ہے۔ میں کیسے توبہ کروں۔ ناپاک ہوں"۔[۱۰]

اس واقعہ کے نتیجے میں مزید دو واقعات جنم لیتے ہیں۔ جو ناول کی کہانی کو لے کر تبدیل کر دیتے ہیں ان دو واقعات میں ایک واقعہ پوری طور پر رونما ہوا یعنی احمد شاہ کی ذہنی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرا واقعہ بتدریج رونما ہوتا ہے۔ یہ واقعہ کرامت علی شاہ کے نامرد ہونے سے متعلق ہے۔

عبداللہ حسین نے کرامت علی شاہ کی نامردی کا راز ناول کے آخر میں کرامت علی شاہ کے زبانی بیان کیا وہ یہ سب کچھ اپنے بیٹے سلامت علی شاہ کے اصرار کی وجہ سے اس راز سے پردہ اُٹھاتا ہے۔

" میں بتا ہی چکا ہو۔ اور کیا بتاؤں میں اب کسی لائق نہیں رہا۔ شاہ جی، اس عورت نے آپ کے ساتھ کیا کیا، میری سمجھ سے یہ بالاتر ہے۔"

" اس نے کیا کرنا تھا۔ میرے اپنے نفس کی بات ہے۔ پیر کرامت علی نے کہا۔ "کیا بات ہے"۔ سلامت علی نے اصرار کیا۔ پیر کرامت علی نے لاچاری سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ آخر انہیں بولنا ہی پڑا۔ میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس واقعے کو کئی روز گزر گئے۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا تھا ایک دن اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس بدبخت کا منظر میرے دل پر بیٹھتا جا رہا ہے۔ میں اپنے ازدواجی حقوق حاصل کرنے کو جاتا تو وہ لہو میں لتھڑا ہوا گڈا جو اس نے خدا جانے اپنی کس کوکھ سے کھینچ کر نکالا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ ساتھ ہی

میرے اعضا میں ٹھیس اٹھنی شروع ہو جاتی جیسے وہاں زخم پیدا ہو گئے ہوں۔ میرے پٹھے سکڑ جاتے۔ میں نے خیال کیا وقت کی بات ہے وقت گزر جائے گا۔ مگر یہ منظر تو میری آنکھوں کے پردوں، پر پتھر کی لکیر کی طرح جم گیا تھا۔ لاکھ چلے کیے، یہ مدھم نہ پڑا۔ نہ اس کا اثر کم ہوا ایک نوزائیدہ کے ناڑ میں بندھا ہوا وہ کھلونا جس سے خون اور رطوبتوں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میری مردانگی کا سرقہ کر کے لے گیا۔ مجھے ہر عورت کے رانوں پر گندے سے خون کے چٹاخ نظر آتے ہیں۔ کئی مہینے گزر گیے تو آخر مجھے پتہ چلا کہ میں اب ہمیشہ کے لیے عورت کے ناقابل ہو چکا ہوں"۔(۱۱)

اس واقعے کے بعد کرامت علی شاہ اپنی سرکاری نوکری چھوڑ دیتا ہے اور گاوں آکر مسجد میں ڈیرا ڈال دیتا ہے اور پیر بن کر سامنے آتا ہے۔ لیکن احمد شاہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے بعد میں وہ نانگا سائیں کے نام سے معروف ہو جاتا ہے۔

بعد میں یہ دونوں ایک ہی دن مر جاتے ہیں۔ لیکن نانگا سائیں کی موت کا کسی کو معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس کی لاش میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ یعنی مصنف نے انجام برا دکھانے کے لیے اس کے بدن میں کیڑے پڑوا دیے۔ کرامت علی شاہ وفات کے بعد سلامت علی گدی نشین بنتا ہے اور ایک نئی نسل اقتدار اور مذہبی استحصال کے اس کھیل میں شریک ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو خاص اس نقطہ نظر سے پروان چڑھاتا ہے کہ وہ اس کے ادھورے کام مکمل کرے گا جیسے وہ خود سیاست میں حصہ نہیں لے سکا اس کا بیٹا سیاست کے میدان میں بھی معرکے مارے گا۔

لیکن اس بار کرامت علی شاہ نے منفرد حکمت عملی سے کام لیا اور اپنا مشیر خاص ایک ریٹائرڈ برگیڈیئر کو مقرر کرتا ہے تا کہ پورے ملک میں اپنے روحانی نیٹ ورک کو وسعت دی جا سکے۔ اس کے ساتھ وہ سیاست میں بھی اپنا لوہا منوانا چاہتا تھا۔ ریٹائرڈ برگیڈیئر کی حیثیت علامتی ہے۔ اقتدار کے کھیل میں یہ علامت فوج کی شمولیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ناول کے آخری میں مصنف نے مائی سروری کے کردار کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے اس کا ذکر ناول کے آغاز میں ہوتا ہے لیکن اس کے بعد یہ کردار ہی پس منظر میں چلا جاتا ہے اور اس کا ذکر ناول کے آخر میں ہوتا ہے۔ ناول کے آخر میں مائی سروری میں آنے والی تبدیلی کو مصنف علامت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یوں مائی سروری کی علامت اپنی پوری صورت میں ناول کے اختتام پر قاری پر آشکار ہوتی ہے۔

مائی سروری کا اپنے کام کاج شروع اور عام لوگوں کی طرح زندگی گزارنا اس بات کی علامت ہے کہ روایت جو بظاہر فنا کی زد میں تھی پھر سے جاری ہو گئی تھی۔ مائی سروری کا کردار ایک نئے دور کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معاشرے کی فرسودہ روایات آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ معاشرے کی فرسودہ روایات ختم ہو جائے گیں اور خواتین کو اپنا حق مل جائے اور معاشرے میں ایک انسان کی حیثیت سے رہنا شروع کر دے گی۔

رضیہ سلطانہ بھی ایک علامتی کردار ہے جو روش خیالی کی مشعل کو جلانے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن رضیہ سلطانہ کو ختم کر دیا گیا۔ سماج نے اس کی آواز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ معاشرے کے استحصالی قوتوں نے پیری مریدی کی آڑ میں نئے دور کی بھاگ دوڑ سنبھالی تھی۔ سلامت علی شاہ نے دوسری قوتوں سے مل کر اپنے باپ کی نسبت کہیں زیادہ مضبوطی سے اپنے قدم جما لیے۔ دیہات کے لوگ اپنا روحانی ومالی استحصال کرنے والے کے جانشین کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ارد گرد دیہاتوں کی لڑکیاں سلامت علی شاہ کے ساتھ ہم بستری کی خواہش میں بے چین ہیں ان تمام چیزوں سے مصنف کی مایوسی واضح ہے۔

عبد اللہ حسین کا ناول "قید" ایک موضوع کے حوالے سے انسانی معاشرے کی اپنی خواہشات کی قید کی علامتی صورت کا اظہار قرار دیا جا سکتا ہے۔

عبد اللہ حسین کے دوسرے سبھی ناولوں کی نسبت قید کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے بہت کھلے انداز میں پیری فقیری کو ہدف تنقید بنایا ہے اور اسے بیوروکریسی، فوج اور سیاست جیسے اداروں سے گٹھ جوڑ دکھایا گیا ہے کہ کیسے یہ سب ادارے اقتدار کے حصول کے لیے گٹھ جوڑ کرتے ہیں جب کہ ان کی بنیاد دھوکہ اور فریب ہے جو عوام سے کرتے ہیں۔ عوام کا استحصال ان کے اقتدار کی کلیدی اکائی ہے۔ یہ ناول ایک تاریخی دستاویز کی اہمیت رکھتا ہے۔ سماجی ناہمواری کو موضوع بنا کر تلخ حقیقت نگار کا کردار ادا کیا ہے۔ پیری و مریدی کے جعلی لوگوں کو تنقید کا موضوع بنا ایک تلخ حقیقت نگار کا کردار ادا کیا ہے۔

ب: عبد اللہ حسین کے نسوانی کرداروں کا روایت سے بغاوت

i. رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطانہ کا کردار ایک علامت ہے ایک استعارہ ہے سماجی ناہمواریوں کے خلاف بغاوت کا نام رضیہ سلطانہ ہے۔ مذہب، تصوف کے نام پر پاکستانی معاشرے میں ان پڑھ اور جاہل لوگوں کی عزت نفس مجروح کرنے والوں کا چہرہ ہے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ کردار تانیثیت کے تحریک کے اصولوں پر قائم نظر آتا ہے۔ رضیہ سلطانہ

ایک بہادر کردار ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو کہ اپنے اوپر کیے گیے غیر انسانی روئے کو تقدیر کا لکھا گیا نہیں مانتی بلکہ اپنے اوپر کیے گیے ظلم و تشدد کا باقاعدہ عملی طور پر ازالہ کرتی ہے۔ پاکستانی معاشرہ دیہات پر مشتمل ہے یہاں پر لوگوں کو مذہب کے نام پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ خواتین پر مشتمل ہے یہ خواتین معیاری ضروریات زندگی اور ان پڑھ ہوتی ہیں تو ایسے میں مذہب فروش، سیاست دان اور جرنیل لوگ ان لوگوں کے جذبات کو بے دردی سے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ رضیہ سلطانہ مردانہ معاشرے میں مرد سے اپنا حق اور اپنا سماجی رتبہ مانگتی نظر آتی ہے یہ شادی، سمجھوتہ اور فرسودہ روایات سے بغاوت کرتی نظر آتی ہے۔ یہ اپنے اوپر اخلاقیات کا بوجھ نہیں رکھنا چاہتی۔ یہ معاشرے میں انسان رہنے کی تحریک چلاتی ہے یہ مانتی ہے کہ عوام میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں یہ صنفی امتیاز مرد کی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ عورت کو سیاسی و سماجی اور معاشی آزادی دی جائے تاکہ ایک انسان کی طرح معاشرے میں سانس لے سکیں۔

عورت کو لونڈی اور اپنی جائیداد کے طور پر رکھنے کی سوچ نے معاشرے کو نقصان پہنچایا ہے عبد اللہ حسین کے "اداس نسلیں"، " نادار لوگ" کے نسائی کردار مظلوم نظر آتے ہیں لیکن یہ رضیہ سلطانہ ہے جو کہ معاشرے میں اپنا وجود، اپنی رائے اور بطور انسان ماننے پر دوسروں سے صحت مند مکالمہ کرتی نظر آتی ہے۔ پاکستان میں عورت کو قبائل، دیہات اور گھر کی چار دیواری تک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت محدود رکھا گیا ہے۔ اس تمام رکاوٹوں کے باوجود عبد اللہ حسین کے اس سماجی ناہمواری کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ پنجاب کے جنوبی علاقہ جات میں یہ پیری مریدی کے ماننے والے زیادہ ہیں۔ تو ایسے میں لوگوں کے سامنے ایک باقاعدہ جعلی تصوف اور لوگوں کے استحصال کے لوگوں کے بے نقاب کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ یہ کردار اُردو ناول کی نسائی مزاحمت کرداروں میں تادیر زندہ رہے گا۔ یہ کردار پڑھتے ہوئے قاری سوچنے لگتا ہے کہ جیسے کوئی انگریزی فلم کی ہیروئین دیکھ رہا ہے لیکن اکیسویں صدی کی لڑکی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ظلم و جسمانی تشدد کا شکار ہو کر خاموش نہیں رہے گی۔ اب پاکستان بھر کی عورت جدید تقاضوں کے مطابق تعلیم حاصل کر رہی ہے مختلف پلیٹ فارمز پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہی ہے اب عورت راج نہ سہی لیکن عورت پر راج کرنا ان کے حقوق نہ دینا یہ تقریباً کم ہو رہا ہے۔ رضیہ سلطانہ کا کردار معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف عملی احتجاج کا نام ہے۔ یہ کردار تعلیمی سرگرمیوں سے لیکر، جلسوں، عہد سازی اور سماج میں ایک انسان بلکہ باشعوری شہری کے طور پے اپنا کردار نبھانا جانتی ہے۔ جاگیر دارانہ سوچ کے حامل لوگوں کو جواب دینا جانتی ہیں۔ رضیہ سلطانہ کو مولوی کا بیٹا فروز شاہ عورت ذات سمجھ کر صرف ہم بستری کرنا چاہتا ہے صرف وقت گزاری کے لیے استعمال میں لاتا ہے عورت جذبات میں آجاتی ہے

لیکن ناول کے آخر میں یہ عورت کردار مولوی پر یہ عیاں کرتی ہے کہ ہم کو پارٹ ٹائم جاب کی طرح استعمال کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اس کرب اور بے چینی کے ماحول کو ناول نگار نے بہت واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر انور احمد اپنے مضمون "قید" سماجی المیہ کی ایک داستان میں لکھتے ہیں:

> "ان کے ناولٹ "قید" کی رضیہ سلطانہ ایک ایسا کردار ہے جس کی پوری بنت سے عبد اللہ حسین نے اس ناولٹ کو موضوعاتی انفرادیت سے ہم کنار کیا ہے۔ "رضیہ کے کردار" ہی کی بدولت اس کے خدوخال کی چاندنی سے اس کی شخصیت کے مخفی پہلو نمایاں ہوتے ہیں"۔[۱۲]

رضیہ سلطانہ کے کردار کا ذہنی پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ حقوق نسواں کا نمائندہ کردار ہے یہ فروز شاہ سے مکالمہ کرکے پوچھتا ہے کہ عوام میں کون کون آتے ہیں؟ یہاں پر رضیہ سلطانہ کے سامنے عورت دشمن عناصر کی عکاسی ہوتی نظر آتی ہے پھر وہ انتقام کے لئے باقاعدہ فکری محاذ کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ یہ کردار وہ سوالات اُٹھاتا ہے جو کہ تاریخ انسانی میں عورت کے ساتھ رہے ہیں۔ چہرے پر بالوں کا نہ آنا، چھاتی اور اپنی کمزوری کا احساس کمتری کا پروزور مطالبہ کرنا۔ یہ کردار تاریخ فکر انسانی میں عورت کے مسائل اور اس کے مسائل کے بدلتے ہوئے مسائل کی نشاندہی کر رہی ہے۔

عبد اللہ حسین اُردو ناول کی روایت میں اس کردار کی وجہ سے زندہ و جاوید رہے گا ناقدین ادب نے رضیہ سلطانہ کے کردار کو مزاحمتی کردار بنایا ہے۔ کردار نسائی رد تشکیل کا نمائندہ کردار ہے۔

اس کے سراپے میں حسن نزاکت اور جوانی کا رنگ روپ پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ عبد اللہ حسین نے اپنے ناولٹ میں جو کردار ادا کرنے کے لیے تخلیق کیا ہے اس کردار کی وضاحت آگے چل کر واضح ہوتی ہے۔ عبد اللہ حسین اس کی وضاحت وکچھ یوں کرتے ہیں۔

> "وہ ایسے لوگوں میں سے تھی جن کے اندر ایک برقی رو دوڑتی معلوم ہوتی تھی۔ جس سے ان کا بدن ہر لحظہ تھرکتا اور حرکت ایک پل کو بھی نہیں رکتی۔ اپنی طبعیت کے لحاظ سے ایک آفت کا پرکالہ بھی۔ وہ دھیما پن جو اس کے خاندان والوں کا وصف جانا جاتا تھا رضیہ سلطانہ میں نام کو نہ تھا۔ ہر بات میں اس کو شرارت سوجھتی تھی اور ہر چیز میں مذاق کا پہلو نکال لیتی۔ گو ذہن کی تیز تھی مگر پڑھائی لکھائی سے زیادہ سروکار نہ رکھتی تھی۔ اس کی بجائے وہ کھیل کود، بحث مباحثہ، تھیٹر ڈرامہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔[۱۳]

اس کے سراپے اور اس کے کردار کے خدوخال کو واضح کرتے ہوئے عبد اللہ حسین اپنے ناولٹ میں اب اس کے جس پہلو کو واضح کرنا چاہتے ہیں وہ عبد اللہ حسین کے اسلوب کے ایک خاص رنگ تجسس سے آشکار ہوتا ہے۔ عبد اللہ حسین ایک حساس اور مشتاق فکشن نگار کی حیثیت سے اسے اس طرح سے سامنے لاتے ہیں کہ اس کا کردار خود بخود ان کے تخلیقی زاویوں سے منعکس ہونے لگتا ہے۔

تعلیمی سرگرمیوں، تقریروں، جلسے جلوسوں، لڑائی جھگڑوں اور عہد بازی کی کشمکش کے ذریعے کالجوں کی سیاست میں طلبہ کے کردار کو بیان کرتے ہوئے عبد اللہ حسین نے رضیہ سلطانہ، فیروز شاہ اور کرامت علی کے کردار کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وہ منظر نامہ دکھایا ہے جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آئے روز ہم دیکھتے اور سنتے ہیں کہ طلبہ سیاست میں پھر سیاست، جیل، رہائی اور تعلیم کے معاملات ایک کڑی در کڑی ایک آزمائش سے گزرتے ہوئے ایک تسلسل میں رواں رہتے ہیں۔ کئی ڈرامائی موڑ کسی کا ملنا، بچھڑنا اور پھر کسی دن اچانک کوئی کردار کسی نہ کسی موڑ پہ ملتا ہے تو اس وقت پلوں کے نیچے سے کافی پانی گزر چکا ہوتا ہے۔

رضیہ فیروز شاہ کی زندگی میں داخل ہو کر بہت آگے نکل جاتی ہے لیکن کرامت علی جب بھی اس کا رضیہ سلطانہ سے آمنا سامنا ہوا اس کے روبرو رضیہ سلطانہ کی وہی شکل وصورت رہی جو باقی دنیا کی نظروں میں آئی۔

رضیہ سلطانہ کا کردار عبد اللہ حسین کا ایک باغی کردار ہے اس کی دوستی فیروز شاہ کے ساتھ ہے رضیہ سلطانہ معاشرے کی پرواہ کیے بغیر فیروز شاہ کے ساتھ بغیر نکاح کہ میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتی ہے۔ فیروز شاہ کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ رضیہ کے ساتھ نکاح کر لے لیکن وہ اس پر رضامند نہیں ہوتی۔

> ”کیوں کرتی۔۔۔ ساری دنیا کا درد دل میں لیے پھرتا تھا جب میرے پاس آتا دو منٹ میں لڑھک جاتا ہے اور منہ پرے کر کے خراٹے لینے لگتا تھا جیسے میں کوئی حیوان ہوں یا پتھر کی کوئی سیل ہوں جس پر رگڑ کر چٹنی بنائی کھائی اور پرے کھڑی کر دی۔ میں آدم زاد ہوں۔ حیوان نہیں ہوں“۔[۱۴]

یہ آواز عبد اللہ حسین کے ہاں دیگر عورت کی آوازوں سے مختلف ہے ان کے ناولوں میں یہ قطعی مختلف اور نئی آواز معلوم ہوتی ہے۔ یہ عورت اس ناول کے علاوہ عبد اللہ حسین کے ہاں ہمیں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ یہ عورت خود شعور نہیں ہے بلکہ جرات مند ہے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرنے کی پوری طاقت رکھتی ہے اس کے رجحان میں جارحیت ہے یہ اپنی حیثیت منوانا بھی جانتی ہے اور اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ چیخ کر سماج کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا سکے۔ سماج میں عورت کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے رضیہ سلطانہ ایک موقع پر بلند لہجے میں کہتی ہے۔

''تمہارے عوام میں ہم لوگ شامل ہوتی ہیں۔۔۔۔ ہم لوگ احساس کمتری لے کر پیدا ہوتی ہیں کوئی ہاتھ لگا جائے تو دوسروں کے منہ کی طرف دیکھتی ہیں''۔(۱۵)

ایسا لگتا ہے کہ عبد اللہ حسین کے ناولوں میں پیش کی جانے والی عورت نے اچانک بغاوت کر دی ہے مرد کردار ہمیشہ سے ویسے ہی ہیں، مطلبی لیکن اسے زندگی کی جدوجہد میں اپنے ساتھ شریک نہ کرنے والے۔ ایک موقع پر رضیہ سلطانہ فیروز شاہ سے پوچھتی ہے تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ وہ عورت کے بارے میں کیا سوچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر آزاد خیالی کے باوجود اندر سے محض ایک مرد ہے جس کے لیے عورت اس کی جوتی کے ہم پلہ ہے۔ جیسے وہ عوام میں شامل نہیں کرتا اور شاہد انسانوں میں بھی نہیں۔

شاذیہ اکبر اپنے مضمون عبد اللہ حسین کے ناولوں میں کردار نگاری کا جائزہ میں لکھتی ہیں۔

''رضیہ میر کا کردار ایک باہمت لڑکی کا ہے جو معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظالمانہ امتیازی سلوک کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور ان سفاک عناصر کو بے نقاب کرتی ہے جو عورت کو جانور سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں''۔(۱۶)

رضیہ سلطانہ کا کردار اس وقت ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جب اس کا بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے رضیہ فیروز شاہ کے گاوں کے رکھوال کے قریب جا کر گنے کے کھیت میں درد تکلیف کا ایک پہاڑ عبور کرتی ہے اور موت کے منہ میں جاتے جاتے بچ جاتی ہے اور بچے کو جنم دیتی ہے جب صبح ہوتی ہے تو اس معصوم کو اس اُمید کے ساتھ مسجد کی سیڑھیوں پر رکھ دیتی ہے جہاں فیروز شاہ کا والد احمد شاہ امام مسجد ہے کہ اس کا بیٹا مر چکا ہے اور اس کی گود خالی ہے اس لیے وہ اُٹھا کر اس معصوم کو گھر لے جائے گا اور اپنا وارث بنالے گا۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ احمد شاہ آنے والے نمازیوں کو کہہ کر حرامی بچے کو اپنے سامنے مروادے گا۔ جب اس معصوم بچے کو مسجد کی سیڑھیوں پر مارا جا رہا تھا تو رضیہ سلطانہ اس وقت کماد کے کھیت میں چھپ کر یہ سارا اندوہ ناک منظر دیکھ رہی تھی۔

اگر رضیہ سلطانہ کی اس ذہنی کیفیت کا تجزیہ کیا جائے تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ رضیہ اپنے بیٹے کی موت کا اندوہ ناک منظر دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے اور اس کے سر پر انتقام کا خون سوار ہو چکا ہے اس کے ہاتھوں میں آنجانی طاقت آچکی ہے وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتی جب تک اپنے معصوم لخت جگر کا بدلہ نہ لے لے۔ وہ انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر ابنارملٹی کا شکار ہو جاتی ہے۔ رضیہ ایک انا پرست کردار ہے جس کی انا کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے اب اسے کسی کروٹ آرام نہیں۔ اس کی زندگی سے سکون ختم ہو چکا ہے۔ وہ تینوں قاتلوں کو قتل کرنے کے لیے اپنے جسم کو ڈھال بناتی ہے۔ جہاں رضیہ نسوانیت کا بھرپور فائدہ اُٹھا کر تینوں قاتلوں کو ان کے بہیمانہ ظلم کی سزا دیتی ہے اور بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ناجائز اور ناپاکی اولاد سمجھ کر مار دیا

گیا۔ لیکن خود ناجائز جنسی تعلق قائم کرنے کے لیے یہ تینوں کردار موقع کی طاق میں ہیں جو ہی موقع ملا ان کی جنسی خواہش بیدار ہو گئی۔ صرف یہی تینوں کردار ہی بلکہ امام مسجد اور پورا گاؤں ہی دوغلے پن کا شکار ہے۔ احمد شاہ اپنے بیٹے کی ایسی تربیت نہ کر پایا کہ وہ کسی نامحرم عورت سے جنسی تعلقات قائم کر کے ناجائز اولاد نہ جنے لیکن دوسری طرف ناجائز معصوم کو دیکھ کر اس کا ایمان جوش میں آ گیا اور اسے مروا دیا۔

رضیہ سلطانہ نے جہاں تینوں قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے جنس کا سہارا لیا ہے وہاں معاشرے کے پر سودہ اور مجموعی مزاج کا بھی پردہ پاش کیا ہے کہ کس طرح ہم دوغلے پن کا شکار ہے۔

رضیہ سلطانہ ایک بھرپور کردار ہے جو انا پرست بھی ہے اور مثالیت پسند بھی۔ رضیہ سلطانہ اُردو ناول کا ایک ایسا تابندہ کردار ہے جو اُردو ناول کے قاری کے حافظہ میں دیر تک محفوظ رہے گا۔ رجو میر ظلم اور جبر کے خلاف ایک بھرپور مضبوط اور توانا آواز ہے۔

ii. مائی سروری

مائی سروری ایک ضمنی کردار ہے ناول کے شروع میں عبد اللہ حسین اس کردار کا تعارف کراتا ہے لیکن اس کے بعد یہ کردار ناول میں کہیں نظر نہیں آتا بلکہ آخر میں نمودار ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ مائی سروری کو عین جوانی میں ایک زمیندار کے بیٹے سے محبت ہو گئی تھی اس محبت میں ناکامی کی بدولت اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے بلکہ عشق میں وہ اس حال تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ گرمی میں بھی گدڑی سر سے نہیں اُتارتی حتی کہ تین تین دنوں تک کھانا نہیں کھاتی۔ مہینے میں صرف ایک بار نہاتی ہے۔ مائی سروری ایک پر اسرار اور مجذوب کردار ہے لیکن ناول کے آخر میں یہ مجذوب اور پر اسرار کردار قاری کے سامنے ایک ایسے انداز میں سامنے آتا ہے کہ قاری حیران ہو جاتا ہے۔

> ''کہا جاتا ہے کہ دن صبح سویرے مائی سروری نے اپنے لحاف کی گدڑی اپنے اوپر سے اتار پھینکی اور چلا چلا کر اصرار کرنے لگی کہ اسے نہلا دیا جائے۔ اس پر صاحب زادہ سلامت علی شاہ کی اماں بھی کہ جیسے کوئی نیند سے بیدار ہو جائے، اگر اس کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ پھر وہ دونوں مل کر نہائیں۔ نہانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو نئے کپڑے پہنائے، بالوں میں تیل ڈالا اور کنگھی کی، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس روز ان دونوں کے چہروں پر ایک پر سکون نور تھا کہ نظر نہ ہلتی تھی۔ اس حکایت کی صحت کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ ایک بات مصدقہ تھی کہ اس دن سے مائی سروری نے اُٹھ کر چلنا پھرنا اور اپنے کام کاج کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ مائی سروری کے سر میں کالے بال اور منہ میں نئے دانت نکلنے لگے تھے''۔[۱۷]

مائی سروری کا پھر سے جی اُٹھنا اور اپنی خلوت سے نکل کر عام لوگوں کی طرح کام کاج شروع کرنا اس بات کی علامت ہے کہ روایت جو بظاہر فنا کی زد میں تھی پھر سے جاری ہو گئی تھی۔ اس بوٹے میں رس بھر آیا تھا اس پر کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ مائی سروری کی ذات میں تبدیلی اصل میں ایک نئے دور کی طرف اشارہ ہے جو روشن خیال کی روایت کے خاتمے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہی ناول نگار کا پیغام ہے جو وہ ہمیں دینا چاہتا ہے مائی سروری کے کردار پر بات کرتے ہوئے نقاد گوہر رفیق سے ماں، کے فطری روپ سے انکار کی ایک علامت قرار دیتے ہیں اور وہ لکھ دیتے ہیں۔

> " مائی سروری ماں کے مقام کو جبری طور پر چھیننے سے پیدا ہونے والی صورت حال کی تجسیم ہے۔ لیکن وہ خاموش ہے۔ اس کا رویہ معاشرے کی بے شمار عورتوں کے طرز احتجاج کا نمائندہ ہے۔ ایک خاموش احتجاج، ایک طلسم اور گھناپن جو عورت کی کمیونٹی کی نمایاں خاصیت کے طور پر عورتوں کی کمیونٹی میں زیر بحث رہتا ہے شاید ہی وہ رویہ ہے جیسے بعض دانشور عورت کے مذہب کا نام دیتے ہیں"۔[۱۸]

iii. نسرین

نسرین ناول کا ایک ضمنی کردار ہے یہ گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی ہے جو پیر کرامت علی شاہ کے بیٹے کو پسند آتی ہے جب دونوں کے تعلقات کا نسرین کے باپ کو علم ہوتا ہے تو وہ ایک روایتی باپ کی طرح اپنی بیٹی پر سکول کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے اس طرح وہ ایک روایتی باپ کی سوچ کی بھینٹ چڑھ جاتی اور سکول کی تعلیم سے محروم ہو جاتی ہے دوسری طرف جب پیر اکرامت علی شاہ کو نسرین اور سلامت علی شاہ کے تعلق کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنے بیٹے کو منع کرتا ہے کہ اس کی یہ حرکت کرامتیہ سلسلے کے زوال باعث بن سکتی تھی۔ پیر کرامت علی شاہ پہلی بار بیٹے سے سختی سے پیش آیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

> "انہوں نے بیٹے کو بتایا کہ نسرین کا گھرانہ آرائیں قوم سے تعلق رکھنے کے علاوہ کسی طور بھی اس قابل نہ تھا کہ اُن کی ٹکر کا گھرانہ سمجھا جائے اور دھمکی دی اگر سلامت علی نے اس حرکت کو جاری رکھا تو وہ اسے حیدر آباد سندھ اپنی پھوپھی کے ہاں بھیج دیں گے اور کبھی اس کی شکل نہ دیکھیں گے"۔[۱۹]

سلامت علی شاہ اپنی محبت کو بھول بھال کر شہر کی رنگینیوں میں گم ہو جاتا ہے اور دوسری طرف نسرین بھی فوج کے لفٹینٹ سے شادی کر کے گرہستن بن جاتی ہے اس کے لیے اپنے سے اونچے سیاسی سماجی اور روحانی

حیثیت والے تعلقات بحال رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس کی محبت ذات پات اور سماجی رتبے کی قید کی سلاخوں میں دم گھٹ کر مر جاتی ہے۔ سلامت علی کو جب نسرین کی شادی کا علم ہوتا ہے تو اسے انگلی میں کانٹا چبھنے کی تکلیف سے زیادہ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ ناول پڑھتے ہوئے ذہن میں کئے سوال ابھرتے ہیں کہ کیا مرد اور عورت سماج میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں؟ کیا دونوں خاندانی قبائلی اور قومی زندگی ایک ہی طرز پہ گزارتے ہیں؟ سیدھا سا جواب ہے کہ نہیں؟ پدر سری معاشرے میں مرد نے اپنی ملکیتی اشیا کی حفاظت کے لیے جو قوانین بنائے وہ عورت پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ سماج کے نام نہاد اخلاقیات اور روایتیں جب تک دنیا میں برقرار رہیں گی عورت براہ راست مرد کی گرفت میں رہے گی اس کی جبلی خواہشات، حسن نزاکت، جذبات و خیالات مردوں کے تصرف میں رہیں گے۔ کیوں کہ مرد ایک بے جان شے کی طرح استعمال نہیں کر سکتی جاگیر دار سماج میں اس کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے۔

ناول کا عنوان "قید" معاشرتی گھٹن، سیاسی و سماجی اور معاشی ناہمواریوں کی طرف انسانی ذہن کو منتقل کرتا ہے۔ اس ناول کا موضوع بیک وقت میں سیاسی و سماجی اور جعلی پیری و مریدی ہے۔ اس ناول کا سیاسی بیانیہ اور مذہبی گھرانوں کی عکاسی ہے۔ اس ناول میں ایک ایسے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے جس پر بات کرتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں۔ اس مسئلے کو عورت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ یہ ناول دراصل سماجی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والے مسائل کی طرف اشارہ ہے کس طرح ان پڑھ اور دیہات کے لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔

پاکستان کا زیادہ تر حصہ دیہات پر مشتمل ہے۔ پاکستان کی آبادی کا زیادہ تر حصہ خواتین پر مشتمل ہے۔ پاکستان میں پسماندگی کا لیول زیادہ ہے ایسے میں عوام کے پاس بنیادی ضروریات زندگی کا نہ ہونا مسائل کی وجہ ٹھہرتا ہے۔ ناول میں بیان ہوئی کہانی کا انداز ڈرامائی اور بیانیہ ہے۔ ناول میں نسائی کردار رضیہ سلطانہ تانیثیت کے تحریک کا نمائندہ کردار ہے۔ ناول کی کہانی اس کردار کے گرد گھومتی ہے۔ یہ کردار سماج میں بطور انسان رہنے کی صدا بلند کرتی ہے۔ یہ مردانہ ذہنیت کے خلاف باقاعدہ احتجاجی تحریک کے طور پر ابھرتی ہوئی نظریے کا نام ہے۔ عورت کی نظر میں مرد ایک ذمہ دار شہری ہو سکتا ہے لیکن مردانہ سوچ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتی ہے۔ عورت کو صرف گھر اور چار دیواری تک محدود رکھنا اپنی عزت اور رتبہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ناول "قید" میں اس معاشرتی ناہمواری کے خلاف باقاعدی عملی احتجاج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ فکر انسانی میں عورت کے مختلف مقامات گزرے ہیں عورت نے سخت ارتقائی سفر طے کیا ہے اس گھٹن زدہ سفر میں عورت کو مشکل سوالات کا سامنا رہا ہے۔

عورت کے مسائل بدلتے رہے ہیں کم ہونے کے بجائے بڑھتے جارہے ہیں۔ناول "قید" میں رضیہ سلطانہ ایک باشعور شہری ہونے کے ناطے معاشرے میں لوگوں سے بامعنی مکالمہ کرنا چاہتی ہے کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم سے غلطی کیا ہوئی ہے؟ ہماری پیدائش کو لے کر معاشرہ اس قدر تنگ نظری کا مظاہرہ کیوں کرتا ہے؟ ہم اپنی پیدائش کے ذمہ دار تو نہیں؟ ہمارے ساتھ بطور انسان والا سلوک یہاں نہیں کروگے تو کیا چاند پر ہمیں بطور انسان تسلیم کروگے؟ یہ تمام سوالات رضیہ سلطانہ کے تمام سوالات ہیں جو پوچھتی ہے۔اس طرح ناول میں ایک مزاحمتی رویہ سامنے آتا ہے۔ اپنے اوپر ظلم و تشدد اور بربریت کو برداشت کرنا ایک اذیت ناک لمحہ ہوتا ہے۔ لیکن اب جدید عصری تقاضوں اور علوم سے انسانوں کو شعور حاصل ہوا ہے تو ایسے میں بغاوت کرنا ایک پختہ فکری شعور کی نشانی ہوتی ہے۔ انسانی سماج انسانوں پر مشتمل ہوتا ہے انسانی رویے ہی دراصل سماج کو ترقی کو فروغ کا سبب بنتے ہیں۔ناول "قید" میں ان غیر انسانی رویوں پر کڑی تنقید دیکھنے کو ملی ہے۔

ناول "قید" ایک علامت ہے ایک استعارہ ہے جبری گھٹن سماجی ناہمواری کی طرف اور عورتوں پر تشدد اور ظلم کرنے والوں کے خلاف ایک باقاعدہ احتجاج ہے۔ عبد اللہ حسین کو افسانوی ادب میں یہ انفرادیت حاصل رہی ہے کہ اپنے عصری مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے جس طرح "اداس نسلیں" اُردو ناول کی روایت میں سنہرے لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے بالکل اس طرح اُردو ناول کی روایت میں نسائی کرداروں کا مزاحمتی رویہ جب بھی زیر بحث آتا ہے تو ایسے میں "رضیہ سلطانہ" کا ذکر لازم شامل ہوتا ہے۔ لازوال کردار تخلیق کرنے والے مصنف کو قدرت کی طرف یہ انعام ملا ہے کہ ادبی دنیا میں زندہ و جاوید رہے گا۔

ناول "قید" ضخامت کے لحاظ سے مختصر ناول ہے لیکن موضوعاتی لحاظ سے بڑا اہم ناول ہے۔ یہ ناول پاکستانی سماج میں سیاسی نشیب و فراز اور سماجی ناہمواریوں کو موضوع بناتا ہے۔ اپنے منفرد موضوع، اسلوب اور کہانی کی وجہ سے اُردو ناول کی روایت میں یہ ناول زندہ جاوید رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۴۔ ایضاً، ص ۶۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۶۔ عبداللہ حسین، مشمولہ ادبیات (سہ ماہی) شمارہ ۱۷۔۱۱۶، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۶۹

۷۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۰

۸۔ محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۰۳

۹۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۹۶۔ ۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۹

۱۲۔ عبداللہ حسین، مشمولہ ادبیات (سہ ماہی) شمارہ ۱۷۔۱۱۶، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۸۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۱۶۔ عبداللہ حسین، مشمولہ ادبیات، خصوصی شمارہ ۱۷-۱۱۶، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۸ء، اسلام آباد، ص ۳۹۱

۱۷۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۱۵

۱۸۔ گوہر رفیق، ناول قید ایک موضوعی مطالعہ، سہ ماہی، دستاویزی شمارہ نمبر ۹، جنوری تا مارچ، لاہور، ۱۹۱۳ء، ص ۱۱۹

۱۹۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۳۔۲۴

باب پنجم:

ماحصل

اُردو ناول مراۃ العروس سے لے کر اب تک جتنے بھی ناول لکھے گیے ہیں اس میں موضوعاتی سطح زیر بحث رہی ہے اور رہی گی۔ نذیر احمد سے اب تک ناول نگاروں نے کسی نہ کسی موضوع کی مناسبت سے عہد کی تصویر سامنے لانے کی کوششیں کی ہیں۔ ناول کا کینویس وسیع ہوتا ہے یہ انسان زندگی کا مکمل احاطہ کرتا ہے تو ایسے میں اُردو ناول کا بنیادی موضوع عورت اور سماج میں عورت کا کردار اور مرتبہ۔

معلوم انسانی تاریخ میں عورت کا کردار کسی نہ کسی طرح زیر غور رہا ہے۔ عورت کا یہ فکری سفر اکیسویں صدی تک جاری ہے۔ عورت کا کردار اپنی صورت تبدیل کرتا جارہا ہے لیکن عورت کے مسائل حل نہیں ہوئے ہیں بلکہ مسائل کی نوعیت بدل رہی ہیں یہ ایک مشترک موضوع ہے جو کہ ہر عہد میں زیر بحث رہا ہے۔ اُردو ناول کا آغاز عورتوں کی تربیت اور تعلیم سے ہوتا ہے تو اب تک ناول نگار اپنے ناول کا موضوع عورت کو بناتے رہے ہیں ناول نگار عبد اللہ حسین افسانوی ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں'' اداس نسلیں''، ''نادار لوگ''، '' قید''، ''باگھ'' جیسے عظیم فن پارے تخلیق کر چکے ہیں۔

عبد اللہ حسین کے ناولوں میں عورت مختلف مقامات پر مختلف کردار نبھارہی ہے ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے میں عورت کو درپیش مسائل کی تصویر لے کر سامنے آتی ہے۔ پاکستانی معاشرہ جو کہ جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام پر مشتمل ہے بلکہ پاکستانی معاشرے کا ایک کثیر طبقہ دیہات پر مشتمل ہے۔ اس معاشرے میں عورت کا کردار انتہائی متنازعہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ عورت مختلف صورتوں میں سانس لے رہی ہے۔

ادب کی دنیا میں دیکھا جائے تو عورت بے وفائی اور ہرجائی پن کا موضوع بنتی رہی ہے۔ کبھی محبوبہ، کبھی طوائف کی صورت میں۔۔۔ ہندوستانی سماج میں عورت مرد کے ساتھ ساتھ کھڑی نظر آتی ہے لیکن عورت کی حیثیت اُس کمبل کی طرح لگتی ہے کہ جیسے ایک مسافر گرمی میں فرش پر بچھا کر لیٹ جاتا ہے اور سردی میں اوڑھ کر سو جاتا ہے۔ کبھی وہ اس کمبل سے جان چھڑانا بھی چاہتا ہے تو کبھی اس کی جان نہیں چھوڑتا۔ عورت کو اس غلام دارانہ نظام میں مردوں کی ملکیت سمجھا جاتا ہے زمین کے ٹکڑے کی طرح ذاتی ملکیت سمجھا جاتا ہے عورت کو کبھی غیرت کے نام پر قتل کیا جاتا ہے کبھی روایات اور مذہب کے نام پر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اُردو ناول کی روایت

کو دیکھا جائے تو عورت کی ذات پر مسلط کئے جا رہے ہیں تو ادیب اس کا اظہار کرتے رہے ہیں اس روایت میں کرشن چندر، بیدل، منٹو، عزیز احمد، راشد الخیری، پریم چند اور دوسرے ادیبوں کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناولوں میں قاری کے سامنے رویے اور غیر انسانی رویے سامنے آتے ہیں کہ کس طرح مردانہ سماج میں عورت کو بطور جسم لیا گیا ہے۔ کس طرح مذہب کے نام پر عورت کو بطور جسم استعمال کیا گیا ہے۔ کس طرح روشن خیالی کی بنیاد پر عورت کا استحصال ہوا ہے۔ اس کی وضاحت مذکورہ مقالے میں ہو چکی ہے۔

"اداس نسلیں"، کی عذرا عباس نجمی، شیلا، عائشہ وہ نسائی کردار جو قاری کے سامنے ایک مربوط فکر کے طور پر ابھرتے ہیں کہ سماج معاشرے نے عورت کو کیا دیا ہے؟ کبھی اخلاقیات، مذہب اور روایات کے نام پر عورت کو کس طرح استعمال کیا ہے۔ عورت کو صرف عیاشی کا سامان اور بطور انسان نہ سمجھنے کا شکوہ قاری کو ناولوں میں محسوس ہوتا ہے۔ عورت کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں پائی جاتی ہیں۔ کہ جسمانی طور پر کمزور ہے۔ ضعیف العقل ہے۔ وغیرہ یہ سب قیاس آرائیاں ہیں کیا پاکستان سماج میں عورت مردوں کے برابر مزدوری نہیں کرتی؟ کھیتوں میں مردوں کی طرح کام کرتی نظر آتی ہے۔ روزمرہ زندگی کے گھریلو کام میں عورت مرد سے زیادہ مصروف رہتی ہے ان مردوں کی طرح طاقت کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتی۔ عورت گھر میں بیٹی، بہن کی حیثیت سے مردوں پر انحصار کرتی ہے آگے چل کر بیوی، بہو کی صورت میں مرد پر انحصار کرتی نظر آتی ہے۔ یہاں پر عورت مرد کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہے۔ قدرت نے انسان کے طور پر مرد اور عورت کو پیدا کیا ہے بس معاشرتی رویوں نے مرد کو ظالم اور عورت کو مظلوم بنا دیا ہے۔ اس تضاد کو مد نظر رکھ کر معاشرتی تاریخ میں عورت کے کردار اور عورتوں کے حقوق کے لیے باقاعدہ تحرکیں سامنے آتی ہیں جو عورتوں کے حقوق کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں اب جب کہ اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ اختتام کو ہے لیکن عورت کے مسائل کم ہونے کے بجائے بڑھتے جا رہے ہیں اب عورت کا استعمال ایک فیشن بن گیا ہے سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں عورت صرف اشتہار کی زینت بنی ہوئی ہے۔ ادیب شعراء اس ناانصافی پر اپنی رائے کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناولوں میں قاری کو عورت بطور ایک پراڈکٹ، عیاشی کے سامان کے طور پر ملتی ہے۔ اس کی وضاحت عبداللہ حسین کے ناولوں کے نسائی کرداروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نسائی کردار عذرا عباس کو ایک مشرقی عورت کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ اُسے خاوند نعیم کے سامنے بالکل تابعدار لونڈی کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ نعیم جو کہ ہندوستانی معاشرے میں مردانہ ذہنیت کی تصویر پیش کرتا ہے ہر عورت کو اس کی جوانی اور عہدے کی طور پر قبول کرتا ہے۔ ایک عورت بوڑھی ہو کر کس طرح عدم تحفظ کا شکار ہوتی ہے اس کا عملی نمونہ قاری کو اُداس نسلیں میں عذرا عباس کی صورت میں نظر آتا ہے۔ رات کو اچانک نعیم اکتاہٹ کا شکار ہو کر کمرے سے باہر نکال دیتا ہے یہ وہ

عورت ہوتی ہے جو کہ شادی کے فیصلے سے لے کر نعیم کی بیماری تک ایک تابعدار، فرماں بردار مشرقی اقدار کی حامل یافتہ عورت نظر آتی ہے یہ اپنے شوہر کی بطور مجازی خدا جیسی قدر کرتی ہے۔ نعیم کا کردار جو کہ جاگیر دارانہ سماج کی عملی تصویر ہے وہ عورت کو صرف جسم اور شے کے طور پر استعمال کرتا نظر آتا ہے۔ یہاں پر تانیثیت کی بھرپور صورت قاری کے سامنے عذرا عباس کی صورت میں نظر آتی ہے۔ یہی نعیم عذرا عباس کے علاوہ نجمی اور ایک نسائی کردار میں ان کی خوبصورتی کی وجہ سے دلچسپی لیتا نظر آتا ہے دراصل یہاں قاری پر عیاں ہوتا ہے کہ عورت کی ذات کس قدر عدم تحفظ کا شکار ہے۔ یہ ناول نگار معاشرتی رویے کی تصویر سامنے رکھتا ہے کہ جاگیر دارانہ نظام میں عورت کو درپیش مسائل کس قدر گھمبیر ہو سکتے ہیں۔

"اداس نسلیں" کا ایک مردانہ کردار علی جو کہ نعیم کا بھائی ہے یہ بھی وہی تصورات لے کر معاشرے میں چل رہا ہے عورت کو بطور شے سمجھتا ہے بطور انسان توجہ کے قابل نہیں سمجھتا۔ شیلا کے ساتھ جسمانی تعلق برقرار رکھتا ہے لیکن ایک مظلوم انسان کے طور پر نسائی کردار سے ہمدردی صرف محدود وقت کے لیے رکھتا ہے۔ یہاں پر قاری کے سامنے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جاگیر دارانہ سماج میں عورت جب تک مرد کے تابع رہتی ہے تو ٹھیک ورنہ ایک دن کوڑے دان میں شاپر کی طرح پھینک دی جاتی ہے۔

شیلا ایک ایسا نسائی کردار ہے جو کہ مردانہ معاشرے میں مردانہ سوچ کی نمائندگی کرتا ہے عورت کے ساتھ ہمدردی اور تعلق کی بنیاد صرف جنس پر مبنی تصورات کی عکاسی کرتا ہے۔ ہر بوڑھا جوان اس نسائی کردار کو صرف ایک شے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ لیکن یہ کردار نسائی شعور سے بھرپور مطالبہ کرتا ہے کہ عورت کے تحفظ اور آزادی کے لئے انسان بننا لازم ہے۔ عورت کے جذبات ہوتے ہیں لہذا بطور جسم یا پرڈاکٹ کے علاوہ بطور انسان برتاؤ کیا جائے ناول میں دکھایا جاتا ہے کہ علی باقاعدہ نکاح کی پیشکش کرتا ہے جو کہ شیلا مان لیتی ہے اس طرح قاری کے ہاں نسائی ردتشکیل اور تانثیت کی شکل واضح کرتی ہیں۔ شیلا "اداس نسلیں" کا ایک نمائندہ نسائی کردار ہے جو کہ بارہ سال کی عمر سے لے کر مردانہ ظلم وزیادتی کا شکار رہا ہے۔ ایک بارہ سال کی بچی کے ساتھ سردار جی پھر اس کے بعد نعیم اس کے بعد علی اس طرح مردانہ سماج میں مردانہ طاقت کے سامنے بے کسی کی تصویر شیلا کا کردار "اداس نسلیں" کا ہر کردار ایک بے یقینی، اداسی اور بیگانگی کا شکار نظر آتا ہے نسائی کردار کو سماج میں عدم تحفظ کا احساس قدرے زیادہ محسوس ہوتا ہے اسی طرح کا ایک نسائی کردار نجمی ہے جو کہ عذرا عباس کی بہن ہے۔ فلسفہ حیات کو محسوس کرتی ہے اپنے اردگرد معاشرے اور سماج کی پرکھ کر سکتی ہے وہ محبت، پیار دولت، عزت اور طبقاتی کشمکش سے آزاد لڑکی ہے۔

یہ کردار سماج میں ناہمواریوں کا سامنا کرنا جانتا ہے اس کردار میں عورت کی مزاحمت مردانہ سماج میں اپنی بقاء کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ کردار عذرا عباس اور نعیم کے تعلق کو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اچھا تصور کرتا ہے۔ زندگی اور سماج سے لڑتے لڑتے یہ کردار زندگی اور مردانہ سماج کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور سمجھوتہ کر لیتا ہے مسعود سے شادی کر لیتی ہے۔ ایک عورت کو بڑھاپا کیسے متاثر کرتا ہے اس کی تصویر ناول نگار نے نجمی کردار کے ذریعے کی ہے۔ اس طرح قاری مجموعی طور پر عورت کی مزاحمت اور سماجی ناہمواریوں کو براہ راست قاری کے سامنے لاتا ہے کہ بغاوت کرنے پر عورت کو کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ اذیت اور مشکلات کی تصویر نجمی کے کردار کے ذریعے عیاں ہوتی ہے۔

عبد اللہ حسین کے ناولوں میں ایسے کرداروں کی پیشکش بہت زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے کہ نسائی کردار جو کہ مرد کے جنسی خواہشات کی بھینٹ چڑھتے ہیں کیوں یہ زندگی کے ان لوگوں میں سے ہیں جن کو مرد اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے استعمال کرتے ہیں اس طرح نسائی متاثرہ کرداروں کی کثرت ہے جو کہ قاری کے سامنے اپنے عہد میں ہونے والی جنسی، آسودگی اور حیوانیت کی تصویر عیاں کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عورت کردار لطف کے لیے جنسی عمل کے لئے آمادہ ہوتی ہے بلکہ ظلم و تشدد کے زور پر عورت کو شاپر کی مانند استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن عبد اللہ حسین کے ناولوں میں قاری پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ عورت کردار اس ظلم و بربریت کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ بھرپور تحریک کی صورت میں ہمیں نسائی شعور کی بیداری اور تانثیت کے رونے دھونے سے ایک الگ فکر کا عملی ثبوت ملتا ہے "قید" ناول میں رضیہ سلطانہ کی صورت میں ، نسرین، کنیز "نادار لوگ"، نجمی "اداس نسلیں" اس طرح درجن کردار جو کہ عورت کے کردار کو فکری محاذ پر اجاگر کرتا ہے۔ ادیب معاشرے کی ناہمواریوں کو قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ جو کہ توہمات، جاگیرداری اور نیم سرمایہ دار نظام پر مشتمل ہے اس میں عورت روایات، سیاست، مذہب کے نام پر بنیادی انسانی ضروریات سے قاصر ہے۔ بھٹہ، دفاتر، کالج وغیرہ میں عورت کو بطور نمائش کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ عورت کی آزادی کو فحاشی کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن عبد اللہ حسین کے ناولوں میں قاری کے سامنے عورت کی وہ تصویر سامنے آتی ہے جو کہ ہمارا اجتماعی رویہ رہا ہے۔ بطور مذہب قوم ہم نے عورت کو کیسے دیکھا ہے؟ عورت کو کس قدر اہمیت دی ہے؟ یہ سوالات عبد اللہ حسین اپنے قاری سے کرتا ہے۔ عبد اللہ حسین کے نسوانی کردار مکمل تانثیت کے حامی نہیں لیکن مردانہ معاشرے کے ظلم و تشدد کے شکار ضرور ہیں۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے اب کہ ناولوں میں باریک بینی سے دیکھا گیا کہ عورت کی مزاحمت سماج میں فرسودہ روایات عقائد کے بارے میں کھل کر سامنے آتی ہے جب ناول

"قید" میں رضیہ سلطانہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے پیر صاحب اور دوسرے مذہبی لوگوں کو سامنے لاتی ہے دراصل ہمارے ہاں مذہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ لیکن مذہب کو پڑھنے سمجھنے والے نہیں ضعیف العتقاد لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں نقلی پیر، جاہل لوگ کم عقیدہ کمزور عقیدہ لوگ جعلی پیروں کے ہاتھوں استعمال ہو کر اپنا نقصان کر دیتے ہیں۔ اس اہم مسئلے کو عبد اللہ حسین نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ فرسودہ روایات سے بغاوت کا ہر گز مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی کو تنقید کا موضوع بناتا۔ ایک تلخ حقیقت نگار کا فرض بنتا ہے کہ معاشرے کی ناہمواری کو موضوع بنایا جائے۔

عبد اللہ حسن کے مذکورہ ناولوں میں نسائی کردار باقاعدہ مزاحمت کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن جو کہ زیر بحث موضوع ہے وہ یہ ہے کہ عورت کس قدر کامیاب ہوتی ہے اس مزاحمت میں یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ لیکن ایک فکری محاذ کی طرف ناول نگار نے اشارہ کیا ہے کہ بطور قوم اجتماعی رویہ غیر انسانی رویہ ہم نے عورت کے ساتھ اپنایا ہے جس کا انجام برا ہو سکتا ہے آج پاکستانی معاشرہ گھٹن کا شکار ہے تو ایسے میں عورت مزاحمت تحریکیں پروان چڑھ رہی ہیں تو دراصل یہ شعوری بیداری نسائی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔ عورت کو بطور انسان سمجھنا یہ دراصل ایک مہذب انسان ہونے کی نشانی ہے۔ ہم نے عبد اللہ حسین کے ناولوں میں عورت کے مزاحتمی رویہ کو محسوس کیا اور باقاعدہ دلیل کے ساتھ تجزیہ بھی کیا ہے۔ معیار کا فیصلہ اہل علم پر چھوڑا ہے۔

الف: نتائج

- عبد اللہ حسین کے ناولوں میں معاشرتی ناہمواریوں میں سب سے بڑی ناہمواری عورت پر ظلم و تشدد بھی ہے۔
- عبد اللہ حسین کے نسائی کردار تانثیت کے حامی نہیں لیکن معاشرتی جبر کے شکار ہیں۔ اور اس جبر کے تلے سانس لے رہے ہیں۔
- فرسودہ روایات، ضعیف العتقادی جیسے توہمات پر سوالات اُٹھانا عبد اللہ حسین کا وصف ہے۔
- نسائی کردار مردانہ کرداروں کی طرح پختہ فکر نہیں لیکن ایک مربوط فکر کی طرف اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔
- جاگیر دارنہ نظام سے پیدا ہونے والے مسائل کی وجہ سے عورت کو درپیش مسائل کا بیان ملتا ہے۔
- عبد اللہ حسین کے ناولوں میں نسائی کردار تانثیت اور نسائی رد تشکیل کے علمبردار نہیں لیکن بھرپور مردانہ ظلم و تشدد کے شکار ہیں۔

ب: سفارشات

- عبداللہ حسین کے ناولوں میں جاگیر دارانہ نظام سے پیدا ہونے والی خرابیاں اور حالات سے قائم معاشرہ مختلف مسائل کا شکار ہے اس کا نفسیاتی، سماجی و سیاسی تناظر میں مطالعہ ممکن ہے۔
- مذہب اور روایات کے نام پر عورت کو کس طرح استحصال کا نشانہ بنایا گیا ہے اس تناظر میں بھی مطالعہ ممکن ہے۔
- عبداللہ حسین کے ناولوں کے علاوہ افسانوں میں نسائی کرداروں کا سیاسی و سماجی تناظر میں مطالعہ ممکن ہے۔
- افسانوی ادب میں عبداللہ حسین ایک زندہ کردار ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی و تنقیدی کام ممکن ہے۔
- عبداللہ حسین کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش اور اخلاقی کشمکش کے تناظر میں مطالعہ ممکن ہے۔
- عبداللہ حسین کے ناولوں میں مردانہ کردار، ریاستی جبر، معاشرتی ناہمواریوں اور استحصال کا شکار ہے اس تناظر میں بھی مطالعہ ممکن ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

۱۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

۲۔ عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء

۳۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

ثانوی مآخذ

۱۔ ایم سلطانہ بخش، پاکستانی اہل قلم خواتین ایک ادبی جائزہ، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

۲۔ جاوید اقبال، آزادی نسواں زوال نسواں، علم و عرفان پبلشر، ۲۰۰۷ء

۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اُردو ناول، ماڈرن پبلی کیشنز ہاوس، دہلی ۱۹۹۵ء

۴۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، فکشن ہاوس، لاہور ۲۰۱۷ء

۵۔ روشن ندیم، ڈاکٹر، منٹو کی عورتیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

۶۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۰ء

۷۔ سید ابوالاعلی مودودی، پردہ، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء

۸۔ صاحب علی، ڈاکٹر، اُردو فکشن کا مطالعہ، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۸ء

۹۔ قاضی عابد، اردو ادب اور تانیثیت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

۱۰۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ، اُردو افسانہ اور عورت"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۱۱۔ عظمیٰ فرمان، اردو ادب میں نسائی تنقید، شعبہ اُردو، ۲۰۱۰ء

۱۲۔ فہمیدہ ریاض، ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء

۱۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر "تاریخ اور عورت"، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۴۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

۱۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کی ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۲ء

۱۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۷ء

۱۷۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
۱۸۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
۱۹۔ یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اُردو ناول، ترقی اُردو ہند، دہلی، ۲۰۰۳ء

غیر مطبوعہ

۱۔ سعدیہ تبسم، نادار لوگ، فکری و فنی جائزہ، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
۲۔ صنوبر الطاف، منتخب پاکستانی اردو ناولوں میں تصور ہیرئن، ایک تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء
۳۔ عائشہ حمید، پاکستانی اردو شاعرات پر بیسوی صدی کی ادبی تحریکوں کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
۴۔ محمد عثمان، عبداللہ حسین کے ناول، نادار لوگ میں موضوعاتی و کرداری تنوع کا مطالعہ، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۱۹ء
۵۔ محمد ندیم اسلم، بیسوی صدی کے سیاسی اور سماجی حوالے سے منٹو کے افسانوں میں عورت کا کردار، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

رسائل و جرائد

۱۔ ادبیات، عبداللہ حسین نمبر، شمارہ نمبر ۱۷-۱۱۶، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۸ء، اسلام آباد
۲۔ معیار، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۵، جنوری ۲۰۱۱ء تا جون ۲۰۱۱ء

لغات

۱۔ سید احمد بریلوی، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء
۲۔ مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء
۳۔ نورالحسن کاکوری، نور اللغات، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۱۹۹۸ء

انسائیکلوپیڈیا

۱۔ Encyclopedia of Indian culture by R.N saletore, Vol:4
Sterling Publishe, New Dehli.

ویب گاہیں

۱۔ en.m. wikipedia.com/postfeminism-7-8-2018,
www.britannica.com/History of feminism, re trieved on 23-2-2018